سالنامہ بزمِ اردو

جامعہ عثمانیہ

بابتہ سنہ ۱۳۴۳ف

مرتبہ

میر سعادت علی رضوی بی۔اے

(صدر بزمِ اردو)

از پیش ملاحظہ عالیجناب معلی القاب سرکار نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ

سالنامۂ بزمِ اردو

جامعۂ عثمانیہ

بابتہ سنہ ۱۳۴۳ف

مُرتّبہ

میر سعادت علی رضوی بی۔اے

صدر بزم اردو

مطبوعہ مطبع عہد آفریں۔ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

از

میر سعادت علی رضوی (بی۔ اے) صدر بزم و مدیر سالنامہ بزم اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

بزم اردو ۱۰؍ آبان ۱۳۴۲ف میں قائم ہوئی۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی کچھ دنوں کے لئے اس بزم کا قیام ہوا تھا مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا جامعہ عثمانیہ کے لئے جو خاص ادب اردو کی ترقی کی ذمہ دار ہے ایک ایسی بزم کی ضرورت تھی جو اردو کا ذوق رکھنے والے طلبہ کی ادبی دلچسپیوں میں اضافہ کرے۔

بزم کا افتتاحی جلسہ شاندار پیمانہ پر ہوا جس میں علاوہ اساتذہ اور طلبائے کالج کے حیدرآباد کے اکثر معزز عہدہ دار اور ادیب بھی شریک تھے۔ اس سال کے منتخب صدر نواب ظہیر الدین خاں صاحب فرزند نواب معین الدولہ بہادر اور معتمد ابو الخیر سید ابراہیم حسینی صاحب کی کوششوں سے چھ معمولی جلسے مقرر کئے گئے جن میں پانچ مباحثے ہوئے اور ایک مقالہ پڑھا گیا تین غیر معمولی جلسے ہوئے جن میں مولوی عبدالحق صاحب صدر شعبہ اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ اور مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے "اردو کے طالب علموں کی ضروریات" اور "اردو مضمون نگاری" پر مفید اور پر از معلومات تقریریں فرمائیں ایک مشاعرہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی مرحوم کی زیر صدارت منعقد کیا گیا جو نہایت کامیاب رہا۔

اس کے علاوہ اِس سال کا ایک نمایاں کارنامہ "بین الکلیاتی فی البدیہہ تحریری مقابلہ" تھا جس میں جامعہ عثمانیہ کے علاوہ نظام کالج اور نگ آباد کالج اور زنانہ کالج نامپلی کے طلبہ اور طالبات نے بھی حصہ لیا۔ بہترین مضمون کے لئے صدر بزم نواب ظہیر الدین خاں صاحب نے ایک رولنگ کپ عنایت فرمایا جو عزیز احمد صاحب طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ نے حاصل کیا۔ دوم اور سوم آنے والوں کو بھی نظمائے بزم کی طرف سے کتابیں انعام میں دی گئیں بزم کی جانب سے ایک ڈرامہ کالج کے دن" مصنفہ عزیز احمد صاحب جشن یوم کلیہ کے موقع پر اسٹیج کیا گیا جو نہایت کامیاب رہا۔ دوسرے سال یعنی ۱۳۴۱و۴۲ فصلی کے منتخب صدر عزیز احمد صاحب و معتمد زاہد علی صاحب کامل نے چار مباحثے اور تین غیر معمولی جلسے منعقد کئے۔ مولوی عبد القادر صاحب سروری پروفیسر اردو نے" اردو کے اولین قصے" کے عنوان پر ایک پُر مغز مقالہ سنایا جس میں اردو کے قصوں کی ابتدا ارتقا اور زوال پر تحقیقی معلومات پیش کیں۔ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب پروفیسر عمرانیات نے" ہندی شاعری" پر ایک عالمانہ مقالہ پڑھا جس میں ہندی کی اہمیت اور مسلمان بادشاہوں نے جو خدمات کیں ہیں ان کو تفصیلاً بیان کیا۔

علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی مرحوم نے" پیثا برج کے سبع سیارہ" پر ایک تقریر فرمائی۔ بزم اردو کو فخر ہے کہ علامۂ مرحوم کی آخری اور اہم تقریر اس قدر کبرسنی میں اسی کے زیر سرپرستی منعقد ہوئی۔

بزم کی علمی مشغولیتوں میں ایک اور شاندار اضافہ جو اس سال ظہور میں آیا وہ "بین الکلیاتی تقریری مقابلہ" تھا جس میں اول آنے والے طالب علم علی اطہر صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ کو ایک رولنگ کپ راقم نے پیش کیا۔ اس سال (۱۳۴۲و۴۳ف) راقم صدر اور مخدوم محی الدین صاحب معتمد منتخب ہوئے ہم نے صرف دو مباحثے اور ایک غیر معمولی جلسہ منعقد کیا جس میں عزیز احمد صاحب سابق صدر نے" روسی تھیسٹر" پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا۔

تعلیمی تفریح اور ایک ادبی رسالہ کا اجرا دو سال سے پیش نظر تھا۔ اس سال ہم نے ان دونوں کو عملی جامہ پہنایا۔ ساٹھ طلبہ کی ایک جماعت نے زیر نگرانی ڈاکٹر زور صاحب مولوی عبد القادر صاحب سروری قلعہ گولکنڈہ اور سلاطین قطب شاہی کی گنبدوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ محترم اساتذہ نے ہر جگہ بادشاہوں کے حالات ان کی ادبی دلچسپی اور تصانیف پر مختصر تقریریں کیں اور اس میدان میں ہمارا یہ پہلا قدم نہایت کامیاب رہا۔ رسالہ جو اس وقت ناظرین کے زیر مطالعہ ہے۔ آپ اپنی خوبیوں کا شاہد ہے۔ جس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں البتہ اس کا ادبی معیار خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ہمارے

اراکین کی ادبی مصروفیتیں جواب تک منظر عام پر نہ آئی تھیں اُن کے شغف اور بزم کی کامیابی پر روشنی ڈالنے کے لئے بہت کافی ہے۔

اس سالنامے میں بعض مضامین اراکین کی اُن کتابوں سے لئے گئے ہیں جو زیر طبع یا زیر ترتیب ہیں مثلاً "میر حسن کے استاد" جو غلام محمد خاں صاحب کی کتاب "اردو کی شاعری" سے لیا گیا ہے۔ "ملٹن اور تعشّق" جو میر حسن صاحب کی "تاریخ ادب انگریزی" کا ایک جزو ہے اور "ٹیگور" جو مخدوم محی الدین صاحب کی کتاب "ٹیگور" سے ماخوذ ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اصل کتابوں کی اہمیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی۔ بقیہ مضامین سے جو خاص اسی سالنامہ کے لئے لکھے گئے ہیں اراکین کی تحقیقی و تنقیدی ذوق کا پتہ ملتا ہے۔ عزیز احمد صاحب نے ہندستان کے مشہور قومی شاعر کے اردو کلام پر ایک نئے پہلو سے نظر ڈالکر ایک فاضلانہ تنقید کے ساتھ اپنے وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے اور نواب ظہیر الدین خاں صاحب کا مضمون "شمس الامراء" اردو دان طبقہ کو اُس سلسلے سے روشناس کرا رہا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بزم نواب صاحب کے اس ادبی ذوق کی مشکور ہے۔ محسن بن شبیر صاحب نے بھی ایک انوکھے عنوان پر قلم اٹھایا ہے جو اب تک اچھوتا تھا اور کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

ہمارے اراکین جس طرح نثر کے میدان میں تیز قدمی دکھا رہے ہیں اسی طرح گلشن نظم کی آبیاری میں بھی کافی حصہ لیتے ہیں چنانچہ اسی سالنامہ کی نظمیں ان کی شعری استعداد کا ثبوت دیتی ہیں۔

ان تمام مصروفیتوں میں ہمارے ہمدرد اساتذہ مولوی عبدالحق صاحب صدر شعبہ اردو۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے جو وقتاً فوقتاً ہماری رہنمائی اور مدد فرمائی ہے اس کی سپاس گزاری ناممکن ہے۔ حق یہ ہے کہ بغیر ان حضرات کے مفید مشوروں کے ہم اپنے مقاصد میں اس قدر کامیاب نہ ہوتے۔ عالیجناب مولوی عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہے جنہوں نے باوجود عدیم الفرصتی کے ہمارے تمام کاروبار میں ہمیشہ دلچسپی لی اور ہمت افزائی فرماتے رہے۔ آخر میں میں اپنے اُن کرم فرما دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سالنامہ کے اجرا میں میرا ہاتھ بٹایا اور اپنا قیمتی وقت صرف کرکے اس کو کامیاب بنایا۔ فقط

(از)

غلام محمد خاں صاحب تابی بی۔ اے عثمانیہ متعلم ام۔ اے (آخری) مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ

میرحسن کا اصل نام میر غلام حسن اور تخلص حسن ہے۔ لیکن وہ اب تک اپنے پورے نام سے اور نہ ہی تخلص سے مشہور ہوئے بلکہ میر حسن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ دلی میں پیدا ہوئے اور ایک بڑے عرصہ تک وہیں بود و باش کی۔ والد کا نام میر غلام حسین تھا اور ضاحک تخلص کرتے تھے تخلص انکی مناسب حال تھا اس لئے کہ غلام حسین بہت ہی ہشاش بشاش اور ہنسوڑ واقع ہوئے تھے چونکہ عربی میں ضاحک کے معنے بہت ہنسنے والے کے ہیں شاید اسی مناسبت سے غلام حسین نے ضاحک تخلص اختیار کیا۔

میر حسن پرانی دلی محلہ سید واڑہ سنہ ۱۱۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ خود باپ نے ان کی تربیت کی اور فارسی زبان کی تعلیم دی۔ میر حسن صرف اُردو فارسی کے ماہر اور عربی سے بالکل ناواقف تھے۔ شاعری ان کا آبائی پیشہ تھا اس لئے خود بخود یہ میراث ان کے ورثہ میں آگئی۔ ابھی وہ بچے ہی تھے کہ اُن کی ٹوٹی پھوٹی زبان سے چیدہ چیدہ مصرعے ٹپک پڑے باپ کو بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹے کی خاص طور پر نگرانی کرنے لگے۔ جب تھوڑا بہت ہوش آگیا تو اچھے اچھے شعر کہنے لگے۔ چار پانچ شعر کی جوں ہی ایک غزل موزوں کی والد بزرگوار کے پاس اصلاح کی غرض سے لیکر پہنچے

چونکہ میر حسن ایک فطری شاعر تھے ان کی طبیعت شاعری کے لئے نہایت موزوں تھی اور یہ کہ وہ محض آمد کے بل پر شعر کہتے تھے اس لحاظ سے ان کے اشعار میں بہت کم اصلاح و درستی کی ضرورت پیش آتی تھی۔

میر حسن کا ابھی عنوانِ شباب ہی تھا کہ دلی پر تباہی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اکثر خاندان پریشان حال ہو کر لکھنؤ اور دوسرے مقامات کو سدھارے۔ اسی مرحلہ میں میر ضاحک نے بھی لکھنؤ کی راہ لی اور میر حسن بھی اپنے والد کے ساتھ ہولئے پہلے فیض آباد پہنچے یہاں کچھ عرصہ رہ کر لکھنؤ چلے گئے۔

میر حسن کی شاگردی کے بارے میں کچھ اختلافات ہیں۔ یہ امر تو مسلّم ہے کہ پہلے پہلے وہ خود اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ جانے کے بعد اُنھوں نے میر ضیاء الدین ضیا نامی استاد کی شاگردی اختیار کی لیکن ان کا رنگ پسند نہ آیا شاید کچھ عرصہ بعد یہ سلسلۂ تلمذ جاتا رہا۔ اپنی شاگردی کے بارے میں خود اُنھوں نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کچھ لکھا ہے ہم اس کو یہاں بعینہٖ نقل کئے دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:۔ " نیر آسمان سیادت و گوہر بحر شرافت ذکائے وے بکمال ضیاء و بہائے او در نہایت بہا المتخلص بہ ضیا بدریست از سپہر کمال و صدریست ز مجلس جلال .... . . اکثر شاعران آں دیار اصلاح سخن از میر موصوف میگرند۔ بندہ ہم استفادۂ سخن از آن بزرگوار نمودہ۔ استاد فقیر مؤلف کتاب ہمان است "۔ لیکن درد کے متعلق لکھتے ہیں " اکثر فقیر در خدمت آن بزرگوار میرسد بسیار کرم میفرماید" مگر یہ نہیں لکھا کہ اصلاح وغیرہ بھی لی ہے۔

میر حسن نے اپنا تذکرہ نواب وزیر اودھ آصف الدولہ کے دورِ حکمرانی ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء میں تالیف کیا۔ جبکہ ان کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک پختہ کار اور مشہور شاعر بن گئے تھے لہذا پچاس پچپن برس کی عمر میں ان سے شاگردی کی کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی۔ احیاناً اگر ایسا ہی ہوتا یعنی پچاس برس کی عمر میں بھی میر موصوف نے کسی کی شاگردی کی ہوتی تو وہ میر ضیاء کی طرح اپنے دوسرے استاد کا بھی ذکر کر دیتے یا اس سے پہلے اُنھوں نے جس کسی کو اپنا کلام دکھایا تھا اُس کا نام ظاہر کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے اکثر تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ میر حسن اول اول درد سے اصلاح لیتے تھے اور اوائل عمر میں سودا کو بھی اپنا کلام دکھایا ہے۔

ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ جب میر حسن دلی سے لکھنؤ چلے ہیں تو بالکل نوجوان تھے ایک بار لکھنؤ جانے کے بعد پھر کبھی انہیں دلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اگر انھوں نے درد کی شاگردی کی تھی اور انہیں اپنا کلام اصلاح کی غرض سے دکھایا تھا تو ان کا اولین یہ اخلاقی فرض تھا کہ تذکرہ میں میر ضیاء کے ذکر سے پہلے یا کم از کم بعد ہی اپنے سب سے پہلے محسن و استاد یعنی خواجہ میر درد کا نام نامی لکھ کر اس پر فخر کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں خود یہ نام نہاد شاگرد خاموش ہے۔ مگر ان کی تحریر سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ میر درد کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے اور یہ اکثر درد کے گھر جایا کرتے تھے چونکہ ان کو درد کے کلام کا رنگ مرغوب تھا اس لئے اس سے محظوظ ہوتے اور خود بھی اسی قسم کا کلام کہنے کی کوشش کرتے لیکن اس بات کا کہیں سراغ تک نہیں ملتا کہ آیا وہ درد سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں میر حسن درد کے بڑے مداح ہیں جی کھول کر ان کی تعریف کی ہے لیکن کسی جگہ بھی استادی اور شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ درد کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں" سالک مسالک مکاشفات دینی و ناہج مناہج مجاہدات یقینی از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام بر آسمان سخن مانند خورشید فرد حضرت خواجہ میر المتخلص بہ درد از عالمانِ خوش ذات و از درویشانِ نیکو صفات طنطنۂ فضل و کمال و دبدبۂ جاہ و جلال او بفلک رسیدہ و طناب خیمۂ فکر عالیش چون شعاع مہر از مشرق تا مغرب کشیدہ در بحرِ ضمیرش ہمہ گوہر ناسفتہ و بلبۂ گفتہ او عقلِ آفرینہا گفتہ' مرشد بوادی حقیقت و رہبر بمیدانِ شریعت دل آگاہ وے مخزن اسرارِ خدائی صفائی باطنش محرم کعبۂ کبریائی خسرو اقلیم حال و قال جامع صفات جلال و جمال .... شاعر فارسی و ہندی نے نے غلط این چہ لائق اوست. بل شعر گفتن دون مرتبہ اوست .... دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چون کلام حافظ سراپا انتخاب دام افضالہ۔"

مذکورۂ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ میر حسن درد کے حالات سے کس حد تک واقف تھے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ درد کے بہت بڑے معتقد بھی تھے جن کی بزرگی و عظمت کا سکہ میر حسن کے دل پر جما ہوا تھا۔ مگر کہیں اس چیز کا پتہ نہیں چلتا کہ کسی وقت انھوں نے درد کو کوئی غزل بھی دکھائی یا کبھی اصلاح لی یا یہ کہ مشورہ سخن کیا ہے۔ اگر واقعی میر حسن درد سے فیضِ سخن حاصل کرتے تو میں نہیں سمجھتا کہ انہیں اس کے اظہار میں کوئی امر مانع تھا۔ اگرچہ

اس وقت دراصل میرا ہیرو وہ ہے جس کو ممکنہ طور پر بڑھا نا چڑھانا اور اس کی شہرت و مقبولیت، نیز اُس کی عظمت و بزرگی، علم و فضل اور پایۂ استادی کو عرشِ مُعلّیٰ سے بھی بڑھا دینا مشرقی سوانح نگاری کے لوازمات سے ہے لیکن ہمارے ہیرو کی ذاتِ والاصفات اس قسم کی ظاہری اور نمائشی شہرت سے بے نیاز ہے۔ خود اس کا کلام فصاحت التیام اور معجز بیان اس کے نام نامی کی شہرت و مقبولیت کو چار چاند لگانے کے لئے کافی ہے۔ میرحسن اس میں کوئی کلام نہیں اُردو کا اعلیٰ پایہ مقبول عام اور مشہور شاعر ہے حقیقت میں جس کی شاگردی کے توسل سے اس کے استاد کی شہرت اور مرتبہ میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ زبردستی بھی کسی کو شاگرد بنا دیں۔ اسی طرح اردو اور فارسی کے اکثر تذکرہ نویسوں کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ میرحسن نے آخر عمر میں سودا سے جبکہ وہ دلی سے فیض آباد گئے، اصلاح لی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ میرحسن نے اپنے تذکرہ میں اس کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر میرحسن کو سودا کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوتا تو میرضیا کی طرح اپنے تذکرہ میں اُن کا بھی ذکر کر دیتے۔ اس لئے کہ میرحسن نے سودا کے فیض آباد پہنچنے کے چھ سال بعد اپنا تذکرہ تالیف کیا ہے یعنے ۱۱۸۵ھ م ۱۷۷۱ء میں سودا لکھنو گئے اور ۱۱۹۱ھ م ۱۷۷۷ء میں میرحسن نے تذکرہ لکھا۔ مگر تذکرہ میں سودا کی شاگردی کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں دیا۔ ان وجوہات کی بناء پر ہم خواہ مخواہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میرحسن نے سودا سے بھی مشورہ سخن کیا ہے۔ سودا کا حال لکھتے ہوئے وہ اس طرح تعریف کرتے ہیں "استاد استادان کامل وقادر سرآمد شعرائے زمان در میدان نزاکت بیان فکرش چون مہر گرم است .... اکثر فقیر درخدمت آن بزرگوار میرسد بسیار کرم میفرماید ...."

اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مذکورہُ بالا عبارت کا کیا مفہوم ہے اور کس جملہ یا لفظ سے یہ بات ثابت ہوتا ہے کہ میرحسن سودا سے اِصلاح لیتے تھے۔

ذیل میں ہم اُن مختلف تذکرہ نویسوں کی رائے درج کرتے ہیں۔ جنہوں نے میرحسن کی شاگردی کی تشریح کی ہے :-

ان کے ہمعصر شعرا میں میرتقی میر نے نکات الشعراء میں لکھا ہے "مشق سخن از مرزا رفیع میکند" جو بالکل غلط ہے آگے چل کر لکھتے ہیں "افقر نیز آشناست" معلوم ہوتا ہے کہ یہ آشنائی برائے نام تھی۔ میر صاحب میرحسن کے حالات سے مطلق

آگاہ نہیں تھے یونہی سن سنا کر لکھ دیا ہوگا۔

آبِ حیات میں آزاد لکھتے ہیں کہ "جب تک دلی میں رہے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے۔ اودھ میں جاکر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی" ابوالقاسم حکیم میر قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں لکھا ہے "شاگرد میر ضیاء الدین ضیاء است و از خدمت سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ہم استفادہ نمودہ"۔

موازنۂ انیس و دبیر میں شبلی نے لکھا ہے کہ "میر حسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے لیکن سودا کا پرتو ان پر نہیں پڑا صرف میر درد کا رنگ ہے" اس میں شک نہیں کہ میر حسن کی غزلوں میں درد کا رنگ نمایاں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ انھوں نے شاگردی کی تھی جو یہ رنگ پیدا کیا بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہی تھے جو بعد میں بیان ہوں گے۔

سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ "بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی انہیں کو دکھایا۔ اس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے" مولف مذکور نے آگے چلکر لکھا ہے کہ "میر حسن میر ضیاء کے رسمی طور پر شاگرد تھے" حالانکہ یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے۔ میر حسن میر ضیا کے حقیقی معنی میں شاگرد تھے مگر چونکہ اپنے استاد کی طرح پسند نہ آئی اس لئے دوسروں کی پیروی کی نہ کہ شاگردی۔ مذکورۂ بالا تذکرہ نویسوں کے علاوہ اور دوسرے تذکرہ نویس بھی انہیں درد اور سودا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو صرف میر ضیاء ہی کی استادی کا حوالہ دیتے ہیں۔ مثلاً مصحفی رقمطراز ہے "و شعر خود از نظر میر ضیاء الدین ضیاء .... میگذرانید" مصحفی وہ شخص ہے جو اکثر درد سے بھی ملا جلا کرتا تھا چنانچہ لکھا ہے "اکثر فقیر در خدمتِ آن بزرگ بے غرضانہ میرود" اور میر حسن سے بھی اس کی خاص ملاقات تھی۔ میر و سودا سے بھی اچھے تعلقات رکھتا تھا اس صورت میں اگر میر حسن کو درد اور سودا سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوتا تو میر حسن نہ سہی مصحفی تو اپنے تذکرہ میں اس کا اشارہ کر دیتا۔ مولف گلشن بے خار مصطفےٰ خاں شیفتہ کا بھی اسی پر اتفاق ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں "از تلامذہ میر ضیاء است" میر قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے کہ "از شاگردانِ رشید میر ضیاء است" صاحب گلشن ہند مرزا علی لطف لکھتے ہیں "اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیاء سے لی۔"

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ میر حسن کو اپنے استاد ضیاؔ کی طرز پسند نہ آئی اس لئے انھوں نے بقول مصحفیؔ "بحکم قوتِ ممیزہ قدم برجادۂ مستقیم اساتذہ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سوداؔ و میر تقی میرؔ گذاشتہ کلام خود برجستہ پاکیزگی و شستگی رسانید" مصحفی کی اس تحریر سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ میر حسن ان تینوں استادانِ وقت کے کلام سے متاثر ہوکر اسی رنگ میں خود بھی رنگے جانے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ خود انھوں نے لکھا ہے کہ "اصلاحِ سخن از میر ضیاؔ مسلمہ گرفتہ ام لیکن طرز او فشان از من کماحقہ سرانجام نیافت برقدمِ دیگر بزرگان مثل خواجہ میر دردؔ و میرزا رفیع سوداؔ و میر تقی میر پیروی نمودم" اس آخری جملہ "پیروی نمودم" سے اکثر حضرات کو دھوکا ہوگیا۔ انھوں نے پیروی نمودن کے غلط معنی لئے اور اس سہو کے تحت میر حسن کو دردؔ و سوداؔ کا شاگرد بتادیا۔ پیروی کرنا اور اصلاح لینا دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں۔ اگر کوئی شخص دلی میں رہ کر کسی مشہور کہنہ شاعر کے کلام کی تتبع کرے تو اس پر شاگردی کا اطلاق نہیں آسکتا یہی حال بالکل میر حسن کا بھی تھا۔ وہ ہر اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرتے اُس سے لطف اٹھاتے اور خود بھی اس انداز میں کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ مذکورہ شعرا میں بھی انہیں صرف میر دردؔ کا رنگ زیادہ پسند تھا اور وہ زیادہ تر اس طرز میں کہنے کی کوشش کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دردؔ کے رنگ کی جھلک بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس ملتے جلتے رنگ نے تذکرہ نویسوں کے مغالطہ کو اور بھی مضبوط کردیا۔ شاید انہی وجوہ کی بنا پر ناصر نذیر فراق نے میخانہ درد میں میر حسن کو دردؔ کا شاگرد بتاتے ہوئے صفِ اول میں جگہ دی ہے مذکورۂ بالا دلائل و براہین پر غور کرنے کے بعد ایک مُنصف مزاج شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ میر حسن نہ دردہی کے شاگرد تھے اور نہ سوداؔ کے بلکہ اپنے والد سے اصلاح لی اور پھر لکھنو جاکر میر ضیاؔ کی شاگردی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کا نام نامی درد کے شاگردوں کی فہرست میں شریک کرنے سے مجبور رہیں۔

الحاصل دلی کی تباہی کے بعد جب سب شاعر عروس البلاد سے کوچ کرچکے تو میر حسن نے بھی اپنے والد کے ہمراہ دیگر کی راہ لی یہاں سے لکھن پور ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے جہاں نواب سالار جنگ کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہوگئے۔ بعد ازاں نواب ممدوح کے فرزند نواب میر نوازش علیخاں بہادر کے عرصہ دراز تک مُصاحب رہے جب نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے ۱۱۸۸ء میں بجائے فیض آباد کے لکھنو کو پایۂ تخت قرار دیا سلطنت کے منتقل ہوتے ہی فیض آباد کے جملہ اہل کمال لکھنو چلے گئے اسی مرحلہ میں میر حسن کو بھی جانا پڑا۔ لکھنو آنے کے بعد میر حسن کے اقبال کا ستارہ اور بھی چمک اُٹھا۔

میر حسن کی تصنیفات میں ریختہ کا ایک ضخیم دیوان ہے جس میں ہر صنف شعر پر مناسب انداز میں طبع آزمائی کی گئی ہے اس دیوان میں تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی ایک ہجویں بھی کہی ہیں جن میں نقل کلاونت، ہجو مکان ہجو عظیم کشمیری اور ہجو قصاب وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ شعراء اردو کا ایک تذکرہ بہ زبانِ فارسی ۱۱۹۲ھ میں لکھا ہے۔

اردو ادب کی دنیا میں میر حسن کا نام محض مثنویوں کے باعث اور انہیں بھی سحر البیان کے سبب زندہ اور مشہور ہے یوں تو میر موصوف نے چھوٹی بڑی کئی ایک مثنویاں لکھی ہیں مگر ان میں صرف تین مثنویاں زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی سب سے پہلی مثنوی رموز العارفین ہے جو ۱۱۸۲ھ میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا نام خود اس کے موضوع کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں تصوف و عرفان کے مسائل ہیں۔ چونکہ میر حسن پہلے پہلے مذہبی پیشواؤں کی صحبت میں زیادہ تر رہتے تھے اس لئے ان پر یہ رنگ غالب تھا اور خواجہ میر درد کی صحبت کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا۔ اس مثنوی کا موضوع اور طرز بیان مولوی روم کے کلام سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

ان کی دوسری مشہور مثنوی "گلزار ارم" ہے۔ اس مثنوی کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۱۹۲ کے عدد حاصل ہوتے ہیں یعنے ۱۱۹۲ھ کی تصنیف ہے اس مثنوی کے لکھنے سے میر حسن کا اصل مقصد فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کرنا تھا۔ مگر ضمناً بہت سی چیزیں آگئی ہیں مثلاً اس کے مطالعہ سے ہمیں اس وقت کے لکھنؤ اور فیض آباد کی طرز معاشرت اور تمدن، رسم و رواج، لباس وغیرہ کے متعلق بہت سی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود شاعر کے حالات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کے سفر پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

سحر البیان یہ میر حسن کی آخری تصنیف ہے جو ۱۱۹۹ھ[1] کے ختم پر لکھی گئی۔ یہ وہ مشہور عالم مثنوی ہے جس کے باعث میر حسن

---

[1] قتیل نے اس مثنوی کا سنہ تصنیف اسی طرح تحریر کیا ہے (بحوالہ تذکرہ سدا سکھ دہلوی)

بہ تفتیش تاریخ این مثنوی	کہ گفتش حسن شاعر دہلوی
زدم غوطہ در بحر فکر رسا	کہ آرم بہ کف گوہر مدعا
بگوشم ز ہاتف رسید این ندا	بر این مثنوی باد ہر دل فدا

(مجموعہ تحقیقات علمیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ جلد اول ۱۹۳۳ء "میر حسن" از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ام۔ اے، پی۔ ایچ، ڈی۔)

حقیقی معنی میں میر حسن بنے۔ اس مثنوی کا موضوع نرا عشقیہ ہے۔ بدر منیر اور بے نظیر کے عشق کی ایک خیالی داستان ہے مثنوی ہر اعتبار سے غیر معمولی ستائش کی مستحق ہے۔ اس مثنوی کے متعلق اس کے سنہ تصنیف سے آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس کی تعریف کے پل باندھ کر خواہ مخواہ بھی اپنے موضوع کو طول دوں اس کی تعریف میں میر حسن کا ہمعصر مشہور شاعر مصحفی اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں یوں رطب اللسان ہے "خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ۔ الحق کار کار او ست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ" سحر البیان[1] کے متعلق "میخانہ درد" کے مصنف ناصر نذیر فراق کا خیال ہے کہ اس میں جابجا خواجہ میر درد نے اصلاح دی ہے جو صریحاً غلط ہے اس لئے کہ جس سنہ میں خواجہ صاحب کا دلی میں انتقال ہوا اُسی سنہ کے آخر میں یہ مثنوی لکھی گئی جس کے صلہ میں نواب اودھ نے شاعر کو ایک زریں دو شالہ عطا فرمایا تھا۔

بالآخر عرصہ تک بیمار رہکر عشرۂ محرم ۱۲۰۱ھ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی۔

چون حسن آن بلبلِ خوش داستان — او ازین گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیرین بود لطفش مصحفی — شاعرِ شیرین زبان تاریخ یافت
۱۲۰۱ھ

مفتی گنج میں مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن کئے گئے۔

---

[1] لیکن تنبیہ الجاہلین کے مصنف سدا سکھ دہلوی نے لکھا ہے کہ ...... میر حسن در تمام عمر خود در مثنوی کہ زیادہ از دو ہزار بیت باشد نہ خواہد بود صرف کرد۔ مرزا قتیل بسیار اصلاح دادہ ......"

اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر

(از)

عزیز احمد صاحب بی۔اے۔ متعلم سال پنجم

جستجو گل کی لئے پھرتی ہے اجزاء میں مجھے
حسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں (اقبال)

(۱)

نفسیاتی رجحانات

حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہر انسان میں کم و بیش موجود ہے اور اسی طرح حسن میں محو ہو جانے، حسن کی طرف کھنچ جانے یا حسن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت بھی انسانی فطرت کا ایک عنصر ہے۔

شاعر میں یہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جذبات اس قدر عمیق اور اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ جب ان میں اُبال آتا ہے تو وہ اُس کی ذات میں سما نہیں سکتے، اور الفاظ اور نغمے بن کر اُبل پڑتے ہیں۔

حسن شاعر کے جذبوں پر چھا جاتا ہے، اور جذبوں میں ایک تپش، ایک جوش، ایک بے تابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بے تابی عشق ہے۔ اور جب یہ بے تابی اُس کے قلب کی لطافتوں، اور اُس کے دماغ اور ادراک کی مدد سے الفاظ و معانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔ اسی لئے اگر عشقیہ شاعری کی صحیح تعریف کی کوشش کی جائے تو صرف انہی الفاظ میں اُس کی تعریف کی جاسکے گی کہ وہ ایک اِنسان کے لطیف اِحساسات، اور بے چین جذبات کا عکس ہے اگر یہ عکس بے ساختہ پڑے۔ تو شاعری حقیقی اور سچی ہے۔ اور اگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔ یا کوئی اور مصنوعی دلکشی پیدا کی جائے تو عکس لاکھ خوبصورت ہو اُس میں وہ فطری حقیقت باقی نہیں رہے گی جس طرح عشق ایک اضطراری جذبہ ہے اُسی طرح عشقیہ شاعری میں بھی اِضطرار کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اور یہی اِضطرار شعر میں وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ شعر "متحرک" ہو جاتا ہے۔

عشقیہ شاعری دل کی شاعری ہے، اور اقبال دِل سے زیادہ دماغ کے شاعر ہیں۔ عشق ان کے نزدیک ایک اضطراری چھا جانے والا، محو کر دینے والا جذبہ نہیں، جس کا جادو نہیں، اور اُن کی پوری ہستی کو مسحور کر دے۔ عشق اُنکے نزدیک ایک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں انکے پورے کلام میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جذبات کے افسوں سے اس قدر مسحور ہیں کہ فطرت اُن سے خود بخود لکھوا رہی ہے۔ عشق اُن کی شاعری کا "باعث" نہیں "مقصد" ہے۔

"عشق" کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا ہے۔ اور اِس حقیقت کی جستجو، اس کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اِس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اِس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دُور سے طُور کے شُعلوں کو دیکھ رہا ہے اور اُن تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اِس تصور نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ ایک فلسفیانہ مبحث بنتا گیا۔ دوسرے یہ کہ فطری لطافت، "سادگی اور پرکاری" اور نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے اُن کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے۔

اقبال شاعری کے لئے ہمیشہ ایک "مقصد" کو اپنا منتہائے نظر بنائے رہے۔ خود "شعر" کی اہمیت اُن کے

مقصد میں زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا پیغام الفاظ کی طرح جذبات سے بھی " ماورا " رہا۔ اور ہر وہ شاعر جو پیغام لے کر آتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا رہبر ہوتا ہے۔ محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ ہمیشہ پھیکا رہا۔ جہاں انھوں نے عشق کے جذبے سے اپنی ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے اُن کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہو گئی ہے۔ لیکن جہاں اُنھوں نے عشق کا ایک بلند تر، پاکیزہ تر تصوّر، ایک قوم کے لئے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اُس میں ایک رفعت اور بلندی پیدا ہو گئی ہے۔

اِسی شانِ رہبری نے عشق کو اُن کے نزدیک ایک تصوّر بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصوّر جو ایک شخص نہیں بلکہ قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کو گرما سکے۔

عشقِ اقبال پر چھا نہیں جاتا۔ وہ حُسن کو دیکھنے اور عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُن کا زاویۂ نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اُسے ایک پوری قوم کا زاویۂ نظر بنا سکیں۔

(۲)

اقبال کے کلام میں حُسن و عشق کے عنصر کی نشوونما

اقبال کے مشقِ سخن کے زمانہ میں داغ و امیر کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ " زبان " کی خوبیوں کی طرف شعر فہموں اور شاعروں کی توجہ تھی۔ اور گویہ شاعری برائے نام عشقیہ شاعری تھی۔ مگر اسی کی وجہ سے عشقیہ شاعری کا صحیح مفہوم مٹ چکا تھا۔

" غزل " جب اردو میں آئی تو تصنّع بھی اُس کے ساتھ آیا۔ اور جہاں تصنّع کا زور رہا۔ جذبات کی صحت ختم ہو جاتی ہے۔ لفظی خوبیاں، جب شاعری کا اُصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اردو شاعری سے شعر کی رُوح پرواز کر چکی تھی، مُردہ جسم کی آرائش کی جا رہی تھی، اور مصری ممی کی طرح، طرح طرح کے مسالے لگا کر اس جسم کو باقی رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

اِس ماحول میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ لیکن اِسی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک نیا ماحول بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اور وہ سرسید اور حالی کا پیدا کیا ہوا ماحول تھا۔ مغربی شاعری کے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔

اقبال کی ابتدائی غزل گوئی میں داغ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ داغ سے اُنہوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے وہ بہت معترف تھے۔ داغ کے مرنے پر اُنہوں نے ایک نوحہ بھی لکھا۔ امیر کی شاعری کا بھی اُن پر کافی اثر تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

میں بُت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے
عجیب شئے ہے صنم خانۂ امیر اقبال

اِقبال کا تغزّل بے رُوح اور بے رنگ تھا۔ ابتدا سے لیکر آخر تک کبھی اُنکی غزلیں حقیقت کا خفیف سا اثر بھی پیدا نہ کرسکیں کہیں اُن میں لُطف اور سوز و گداز نہیں۔

بعد کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات نے اور عُلوِ تخیّل نے جا بجا جذبات کے فقدان کی تلافی کی ہے۔ مگر عشقیہ رنگ کہیں نہ نبھ سکا۔

لیکن وہ دوسرا ماحول جو اقبال کی شاعری پر اپنا اثر ڈال رہا تھا یعنی حالی اور سرسید کا ماحول بہت کامیابی سے اقبال کو اپنے آپ میں جذب کرسکا۔ وہ مغربی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور اُن کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اِس بے رُوح تغزّل اور اس حقیقت سے عاری شاعری کا ایک شدید ردِّ عمل اِقبال کی قومی، اخلاقی اور اُن نظموں میں ظاہر ہونے لگا جو اُنھوں نے مناظرِ قدرت یا قدرت کے اہم اجرام کو دیکھکر یا اُن سے مخاطب ہوکر لکھیں۔

اِس زمانہ میں اقبال کے ذہنی ارتقار کے مطالعے کے سلسلے میں ایک بہت اہم چیز معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے جذبے کو ان کی فطرت سے جذباتی مناسبت سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ سب سے زیادہ جن مغربی شاعروں کا اُن پر اثر ہوا وہ گوئٹے۔ ورڈسورتھ۔ شیکسپیر اور گرے۔ تھے۔ اِن میں سے کوئی خالص جذباتی شاعر نہ تھا۔ ہر ایک دِل سے زیادہ دماغ کا شاعر تھا۔ اس اثر سے اقبال کی اِس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر عشق جذبہ بن کر نہیں چھا سکتا تھا۔

فلسفے کے مطالعے نے جہاں اقبال کے تمام تر زاویہ ہائے نگاہ کو ایک مستقل اور مکمل حیثیت دیدی۔ وہاں

حُسن و عشق کے متعلق بھی ایک خاص نقطۂ نظر کی تعمیر کی۔ فطرت ہی نے اُنہیں جذبات پرست طبیعت عطا نہیں کی تھی فلسفے کے مطالعے سے جو ذہنی ارتقا ہوا اُس نے عشق اور حُسن کے مطالعے کو اُن کی شاعری میں بجائے جذبے کے ایک "فکر" بنا دیا اور جس طرح نیم فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ فکر سے وہ زندگی کی اہم خصوصیتوں کو دیکھنے اور پرکھنے لگے، انہوں نے عشق کو بھی دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کا اہم ترین مقصد قومی شاعری تھی۔ عشق کے متعلق ان کا تصوّر تشکیل پا رہا تھا لیکن ابھی یہ تصور "پیغام" نہیں بنا تھا وطنیت اور قومیت اُن کے اہم ترین پیغام تھے۔

یورپ جانے کے بعد اُن کے نقطۂ نظر میں بہت اہم تبدیلی ہونے لگی۔ وطنیت جو اُن کی شاعری کے پہلے دور کا پیغام تھا۔ اُن کو باطل نظر آنے لگا۔ اسلامیات کے مطالعۂ اور گوناگوں مختلف اور متضاد اثرات سے ایک نئے اہم پیغام نے اُن کی ہستی کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ پان اسلامی تحریک ان کو اس قدر متاثر کر گئی کہ وہ وطنیت کے جوش کو بھول گئے۔ اور یہ پان اسلامی تحریک جو مادّی اور رُوحانی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھی، اُن کی ہستی میں ایک اہم انقلاب پیدا کرنے لگی۔

یہ اُن کے قیامِ یورپ کا زمانہ تھا۔ وطنیت کے تخیّل کو وہ باطل قرار دے چکے تھے۔ اور پان اسلامزم کا اثر مُستقل اور مکمل طور پر چھانے نہیں پایا تھا اور اس زمانے میں جب کہ اُن کی ذات اُن کی ہستی میں نئی تعمیر ہو رہی تھی، ایک نئے تخیّل اور نئے تفکر کی دنیا بن رہی تھی، اُن کی شاعری نسبتاً کم اہم اور ذاتی اور شخصی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ اُن کی شاعری کا اصل مقصد یعنی اُن کا "پیغام" ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اُن کی شاعری اس زمانے میں بڑی حد تک شخصی اور ذاتی شاعری بنی رہی۔ جابجا اُنہوں نے جذبات نگاری کی کوشش کی۔ چند عشقیہ نظمیں لکھیں۔ عشق کے متعلق نظمیں لکھیں۔ اِن میں سے کسی نظم میں درد و اثر یا حُسن و لطافت کی گرمی پیدا نہ ہو سکی۔

عشق کا مغربی اثر اُن کی شاعری پر پڑا۔ یہ اثر جو شخصی اور مجازی تھا۔ کبھی تو مجازی جذبے کے شخصی اظہار کی صورت میں (مثلاً .... کی گود میں بلّی کو دیکھکر) کبھی مغربی نظموں سے متاثر خیالات کی شکل میں (مثلاً "حُسن اور زوال") نمودار رہوا۔ یہ اثر محض ایک شاعر کی وقتی "مشغول" سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن عشق کے متعلق جو نظمیں

انھوں نے اس زمانہ میں لکھیں یعنی جن میں ذاتی تاثر زیادہ نمایاں نہیں۔ اور جن کی تحریر "مقصد" رکھتی ہے اُن میں سے اکثر نظمیں باعتبارِ تخیل بہت بلند ہیں۔

پان اسلامزم کے اثرات جو اقبال کے ذہن پر چھا رہے تھے اور اُن کی شاعری کا مذہب بن رہے تھے، اِسی زمانے میں دو مختلف طریقوں سے انکے کلام کے عشقیہ عنصر پر اثر انداز ہوئے ایک تو یہ کہ اُن کے کلام میں مولنا روم کے اثر اور تصوّف کے رنگ کی اِبتدائی چاشنیاں جابجا پیدا ہونے لگیں۔ دوسرے یہ کہ عشق مجازی میں بھی مشرقی اور اِسلامی حُسن کا تخیل اور تصور ایک رُوحانی میعار بننے لگا۔ یہ تصوّر سب سے پہلے ایک مکمل اور دلکش اثر کی شکل میں "سلیمیٰ" کی تحریر کا باعث ہوا۔

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے — خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر — ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

ہر شئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اُس کا

"سلیمیٰ" عرب کی پرانی محبوبہ ہے۔ اور شاعر حقیقت کے کیف کو مجاز میں تخیل کر کے مشرقی شاعری کی روایت کو جس میں مجاز و حقیقت ہمیشہ ایک دوسرے میں عیاں اور نہاں ہوتے ہیں، ایک نئے اور جدید رنگ سے زندہ کرتا ہے۔

عشقِ حقیقی کے عناصر کی نشو و نما پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اِس زمانہ کی عشقیہ شاعری کی چند اور خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ ہر عشقیہ نظم میں اِس کا احساس ہوتا ہے کہ جذبہ دل سے نہیں نکلا تخیل ہمیشہ نظم کی تشکیل کا باعث نظر آتا ہے۔ جذبے میں جوش نہیں، اثر نہیں، حقیقت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی دماغ رنگین کھلونے بنا رہا ہے اور اُن سے تفریحاً کھیل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اکثر نظموں کی تہ میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ یا حقیقی قلبی کیفیت کام کر رہی ہو۔ لیکن کسی طرح یہ واقعہ یا مشاہدہ یا قلبی کیفیت ایسی نہیں ہوتی جو اقبال کو یا بالکل مست کر گئی ہو۔ یا گرما گئی ہو۔ اگر اُن پر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ شعری کام لینا چاہتے ہیں

جذبے کے فقدان کے باعث باوجود تخیّل کی رفعت کے زبان اور تناسب کا جامہ جابجا چاک ہو جاتا ہے۔

زبان کی فطری سادگی، فطری جوش، اور فطری اصلیت کی سب سے زیادہ ضرورت عشقیہ شاعری میں ہوتی ہے۔ اور اقبال کو زبان پر بالکل اختیار نہیں۔ ایک مصرع میں اگر جوش اور اثر ہے تو دوسرا بالکل پھیکا ہے۔ ضرورتِ شعری کیلئے ٹکڑے کے ٹکڑے زبردستی بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بالکل غلط ہے۔ اور وہ تناسب جو شاعری کے جسم کے لئے کسی حسینہ یا کسی حسین مجسمے کے جسم سے زیادہ ضروری ہے تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔

اقبال نے "بانگِ درا" کی اشاعت کے سلسلہ میں اکثر نظموں پر نظرِ ثانی کی۔ اور یو۔پی کے نقادوں کے بے لگام اعتراضات سے کم سے کم اس حد تک متاثر ہوئے کہ زبان کی چند اہم لغزشیں دور کر دیں۔ پھر بھی عشقیہ نظموں کی حد تک یہ تبدیلیاں کافی نہیں ہوئیں۔ جوش اور اصلیت کے لئے زبان کی اس قدر صفائی کافی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر اُن کی مشہور اور ایک حد تک دلفریب نظم "حُسن و عشق" کا پہلا بند یہ ہے۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر — نورِ خورشید کے طُوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل — چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم — موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یوں ہی دل میرا

پہلے مصرعے میں وہ سلاست اور روانی اور بے ساختگی نہیں جو ایک لطیف جذباتی نظم میں ہونا چاہیئے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "آنچل" اس وجہ سے بہت بے محل ہو گیا ہے کہ پوری نظم کے لہجے میں رفعت اور شوکت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ جو کسی زیادہ مادّی نظم میں بہار دے جاتا، اِس نظم میں باوجود اس کے کہ خالی "آنچل" نہیں "نور کا آنچل" ہے۔ نظم کی فضا میں اجنبی سا معلوم ہوتا ہے، اور اس ٹکڑے کی وجہ سے تخیل کے رنگ میں ایک ناہموار شوخی سی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن بعض جگہ یہی نظم اُن بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں — حُسن کا برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے — تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے

حسن کامل ہے تیرا عشق ہے کامل میرا

(۳)

مُطالعۂ فطرت اور حُسن و عشق کے عناصر

فطرت کا مطالعہ اقبال کی شاعری کے اولین اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔ اُن کا مطالعۂ فطرت بھی جذباتی نہیں، ذہنی ہے۔ فطرت سے اُن کی قوتِ ادراک مستفید ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کے حُسن پرست اور عشقیہ عنصر پر اُن کے مطالعۂ فطرت کا اثر ہونا ضروری تھا سب سے زیادہ جس حُسن نے اقبال کے قلب و ادراک پر اثر ڈالا ہے۔ وہ فطرت کا حُسن ہے۔ فطرت کے مختلف عناصر سے مخاطب ہوکر، یا ان کے متعلق اقبال نے نظمیں لکھی ہیں۔

مطالعۂ فطرت کی حد تک ورڈسورتھ کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ فطرت میں وہ دو چیزیں دیکھتے ہیں ایک تو فطرت کے ایک منظر کا تعلق اور ربط دوسرے منظر سے۔ یہ فطرت کی ایک عاشقانہ کیفیت ہے۔ دوسرے انسان اور فطرت کا موازنہ یہاں وہ ورڈسورتھ کو چھوڑ کر مولانا روم اور متصوفین کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان فطرت کا مظہر کامل ہے۔

چنانچہ ان کی وہ نظمیں جن میں حُسن وعشق کے احساسات مطالعۂ فطرت کا نتیجہ ہیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ کہ جن میں وہ فطری عناصر کی باہم محبت، یا کسی منظرِ فطرت کے حُسن یا کسی کے عشق سے نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور اُن سے حُسن اور عشق کے معیار انسانوں کے لئے تعمیر کرتے ہیں ان نظموں میں فطرت، انسان کے معیارِ حُسن وعشق اور ترغیب عشق کے لئے نمونے اور مثال کا کام دیتی ہے۔ مثلاً "جگنو" کی چمک سے وہ حُسن کے اس تصور تک پہنچتے ہیں۔

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بُوئے بُلبل، بُو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

یا مثلاً "غنچۂ ناشگفتہ اور آفتاب" میں سحر کے "عارضِ رنگین" کی جلوہ فرمائی پر کلی کا "سینۂ زرّین" کھول دینا۔ انسانی عشق کی اس دعوت کا بہانہ بن سکتا ہے کہ

مرے خورشید کبھی تو بھی اُٹھا اپنی نقاب — بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب

تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینہ میں — عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

اور اس کے بعد انشراح کی یہ کیفیت مُنقلب ہو جاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دوری میں — صفتِ غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں

دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

دوسری قسم کی وہ نظمیں جن میں مُطالعۂ فطرت حُسن وعشق کے عناصر کی تحریک کا باعث ہوا ہے وہ ہیں جن میں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کا حُسن بے سوز ہے۔ فطرت میں محبت کا شرر نہیں۔ فطرت میں اور انسان میں بھی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ انسان کو عشق نے "حرارتِ سوزِ درونِ دل" عطا کی ہے۔ انسان میں جلنے اور جلانے کی صلاحیت عطا کی ہے یہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مظاہرِ فطرت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کی زندگی فانی ہے۔ انسان عشق کی وجہ سے باقی ہے۔ انسان کو مُحبت کے باعث زندگی دوام حاصل ہے۔ "ستارۂ صبح" جب اپنی بے ثباتی کی شکایت کرتا ہے تو اقبال اُسے اپنے "ریاضِ سخن کی جان پرور" فضا میں بلاتے ہیں کہ

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اُس کی — بنا مثالِ ابد پائے دار ہے اُس کی

یا مثلاً "انسان اور بزمِ قدرت" میں بزمِ قدرت انسان سے کہتی ہے۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود — باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

(۴)

حسن و عشق کے متعلق فلسفیانہ نظمیں

اقبال کی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں سے ایک میں محبت کی تعمیر کا نیم شاعرانہ اور نیم متفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری میں (جس کا خیال جرمن نثر سے لیا گیا ہے) زوالِ حسن اور کائنات پر اس زوال کے حزنیہ اثر کا ہلکا سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں یعنی "محبت" اور "حسن و زوال" میں خیال گہرا ہے، تہ میں ایک مقصد کام کر رہا ہے۔ ان نظموں کی بنیاد واقعات کے تجزے پر رکھی گئی ہے۔ اسی لئے بہت وسیع معنوں میں انہیں فلسفیانہ نظمیں کہا جا سکتا ہے۔

ان میں سے "محبت" میں عشق کی آفرینش کا ایک مخصوص تصور پیش کیا گیا ہے۔ عشق ایک سرمدی راز تھا۔ جو انسان کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ مگر اس مخلوق نے جس میں عبودیت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس راز کو معلوم کر لیا۔ فطرت کی کیفیتوں، اور روحِ خالص کی مختلف خاصیتوں سے یہ نسخہ تیار ہوا۔ تارے سے چمک، چاند سے داغِ جگر، رات سے سیاہی، بجلی سے تڑپ، شبنم سے افتادگی لی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی نفسہائے مسیح اور شانِ ربوبیت سے ادائے بے نیازی کے اثرات لئے گئے۔ اس طرح محبت کی تعمیر ہوئی۔ اور صرف انسان ہی نہیں، پوری فطرت اس نور سے جگمگا اٹھی۔

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چمک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

دوسری نظم یعنی "حسن اور زوال" کا بنیادی تخیل باہر سے لیا گیا ہے۔ مگر پوری نظم یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو خود محسوس کر کے لکھا ہے۔ اس نظم سے دو جداگانہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حسن اور زوال، لازم و ملزوم ہیں۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ہر حسین مظہر کا زوال، زوالِ حسن کا ماتم بھی ہے۔

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

(۵)

اقبال کی اردو شاعری میں تصوف کی جھلک

حسن اور عشق کے تصور اور تخیل میں اقبال کے پختہ تر زاویۂ نظر کا پتہ اُن نظموں میں چلتا ہے جن میں ایک عالمگیر حسن یا ایک عالمگیر حقیقی عشق کا تصور ان کا محرک ہوتا ہے۔ حسن و عشق کی نظموں میں یہ نظمیں سب سے زیادہ بلند ہیں اور ان نظموں سے اُس اقبال کا اندازہ ہوتا ہے جو آگے چل کر اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم اور جاوید نامہ لکھنے والا تھا۔

مولانا روم کا اثر اقبال پر اُسی قدر رہے، جس قدر اثر پلوٹارک کا شکسپیر پر تھا۔ دنیا کا ہر شاعر اُن کے لئے صرف دیکھ لینے کی چیز ہے، مگر مولانا روم کا اثر ان پر بے حد چھایا ہوا ہے۔ کہ بڑی حد تک وہ مولانا کی روشنی میں دنیا کے اہم تر مسائل کو دیکھتے ہیں۔

"شمع" میں یہ اثر پہلی مرتبہ کھلم کھلا ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے زندگی کو سمجھنے کے لئے مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ بہت مدت تک اُن کو حقیقت اور سکون کی جستجو رہی۔ بہت دنوں تک ذوقِ استفہام اُن کو پریشان کرتا رہا۔ پھر جب اُن کو سکون ملا تو تصوف میں ملا۔ غزالی میں نہیں مولانا روم میں۔

اس جستجو اور کاوش کا مکمل ترین اظہار "بچہ اور شمع" کے آخری حصے میں ہوا ہے۔ صرف ظاہری حسن کی نمود شاعر کو تسکین نہیں دے سکی۔ روح کسی اور سکون کے لئے بیتاب ہے۔

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضو گستری شب کی سیہ پوشی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اِس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اِس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

اس جستجو کے بعد تسکین نصیب ہوئی تو اُس تخئیل میں جو مولانا روم نے پیش کیا ہے۔ "شمع" میں وہ کیفیتیں جو مثنوی معنوی میں معراجِ کمال کو پہنچ گئی ہیں جابجا منعکس نظر آتی ہے۔

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق　　آواز کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ　　ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی　　شامِ فراق صبح تھی میرے نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا　　زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں　　غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع حالِ قیدیِ دامِ خیال دیکھ　　مجبوریِ سالکانِ بزمِ فلک کا مآل دیکھ
باندھا مجھے جو اُس نے تو چاہی مری نمود　　تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے　　بندش اگرچہ سُست ہے مضمون بلند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　طوقِ گلوئے حُسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں　　اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حُسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں

پھر چھڑ نہ جائے قصّہ دار و رسن کہیں

اِس نظم میں فطرت کا کوئی منظر اقبال کی نظر کے سامنے نہیں۔ شمع جو مشرقی شاعری کے لوازمات سے ہے' ایک نئے نُور کے ساتھ اُن کے تخیّل میں جل رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ اُس سے خیرہ کن نور حاصل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اُسے ایک نئی روشنی عطا کر رہے ہیں۔

اور یہ منزل' اقبال کے کلام میں حُسن و عشق کے "نصرآآ خری منزل ہے۔

یہ منزل اُن کی شاعری کے پختہ تر مذہب یعنی پان اسلامزم میں جاکر ضم ہو جاتی ہے۔ اور مشرق کے لئے روحانی پیغام بن کر اُن کی فارسی شاعری میں ایک نئی زندگی اختیار کرتی ہے اور اس روحانی پیغام میں عشق کا تصور وہی ہے۔ جو متصوفین اور سالکین کا تھا۔ مگر بالکل نئے رنگ میں' مغرب سے کامل اکتسابِ نور کر کے' مغرب کی مادیت کے خلاف اس پیغام کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اقبال کی شاعرانہ نفسیاتی نشو و نما کی جو منزل آتی ہے اُس میں عشق اور عمل باہم مل جاتے ہیں "پیامِ مشرق" "زبورِ عجم" کے بعض حصّوں اور "جاوید نامے" میں عشق اور عمل کے مشترک اور کامل مشرقی تصور سے مشرق کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

میری انشا پردازی

(از)

غفور احمد صاحب مجددی متعلم سال سوم

افضل گنج کے پل سے گزرتے ہوئے میں نے عینک کی تال درست کرنے کو ہاتھ اٹھایا سامنے سے ایک صاحب کہنے لگے "وعلیکم السلام" گویا میں نے انہی کو سلام کیا تھا۔ میں زیر لب مسکرایا وہ کہنے لگے "مزاج شریف" خوب جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ اب یہ سفید پوش نوجوان راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔" افسوس ہے کہ میں نے جناب کو پہچانا نہیں"۔ "بے شک نہ پہچانا ہوگا" وہ کہنے لگے لیکن میں آپ کو پہچانتا ہوں بھلا کون ایسا بدقسمت ہوگا جو اپنے ملک کے مشہور ادیب حضرت شتاب حیدرآبادی کو نہ پہچانتا ہو۔ آج آپ کی عنایت سے شرف تکلم بھی حاصل ہو گیا" خوب۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے فرصت نہیں۔ علمی مصروفیتیں مہلت نہیں دیتیں۔ اچھا خدا حافظ" وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن میں یہ جا وہ جا ظاہر ہے کہ ایک بلند پایہ ادیب کے لئے یوں بازاروں میں بات چیت کرنا موزوں نہیں اور پھر وقت قیمتی۔ لیکن یہ قیمتی وقت کہاں گزرا ؟ کراچی رسٹورنٹ کے وسیع حال میں !۔

تین چار مہینے کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں ادیب کے جون میں نمودار ہوا ہوں۔ روزانہ اخبار وں ہفتہ وار رسالوں اور ماہانہ مجلوں میں رنگ برنگ کے عجیب و غریب مضامین برساتی کیڑوں کی طرح دھڑا دھڑ نکل رہے ہیں۔ ملک میں شور مچا ہوا ہے اور "ابو البیان" تو ایجاد بندہ تھا ہی اب اس کے ساتھ ادیب العصر کا خطاب بھی جڑ دیا گیا ہے۔ مجھے روحانی مسرت حاصل ہے اور روحانیت کا اثر جسم پر پڑ رہا ہے میں اس قدر سرعت سے موٹا ہو رہا

ہوں کہ میرے قریب سے قریب دوست بھی دور سے پہچاننے میں تامل کرنے لگے ہیں۔ کیا واقعی میں ادیب ہوں؟ کیا سچ مچ میرے مضامین ادبی ہوتے ہیں؟ اس کا جواب سننے سے پہلے میرے مضامین کی نوعیت اور شانِ نزول ملاحظہ فرمایئے۔

چار خانوں میں "چار میناری" گپ شپ سن کر واپس آیا مضمون نگاری کی میز پر مختلف رسائل کے مدیروں کے آٹھ دس خطوط موجود ہیں کسی کی فرمائش افسانہ کی ہے کسی کی مزاحیہ مضمون کی۔ کوئی تنقیدی پہلو پر زور دیتا ہے۔ کوئی تاریخی پر۔ کوئی غزل طلب کرتا ہے تو کوئی قومی نظم۔ خطوط پڑھکر میں نے ایک انگڑائی لی۔ قلم اٹھایا کاغذوں کا پلندہ کھینچا، گردن جھکائی اور ایک کھنکار کے ساتھ مضمون نگاری کی مشین حرکت میں آگئی مشکل سے آدھ گھنٹہ گذرا ہوگا ایک "سنسنی خیز" افسانہ آموجود ہوا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ افسانہ کا عنوان تھا " ہارون رشید اکسلسیر ٹیمپل میں " تین صفحات کے افسانہ میں پندرہ لانبی لانبی "ڈیشین" چھ سات جگہ ناتمام جملے بارہ تیرہ "آہ" "آہ" ہاں ہوں جیسے الفاظ اور الله الله خیر صلاح! تیغ قلم کا دوسرا وار مزاحیہ مضمون پر تھا۔ اس میں کیا تھا؟ کچھ نہیں " ننھے میاں کی والدہ کی داستان" ننھے میاں کی شرارتیں، اپنی مفلسی کا دکھڑا اخباروں پر ریمارک اور بس! تنقیدی مضمون کے لئے میں نے دیوانِ غالب اٹھالیا اور دو شریف پڑھکر بیچ میں سے کھولا پہلا شعر جو نظر آیا یہ تھا۔

نفسِ نالۂ نقشانِ جگر سوختہ کیا ہے اے تمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

پہلے تو شعر کے معنی ہی میری سمجھ میں نہ آئے مختلف شرحوں کی مدد سے پہلے معنی خوب سمجھ لئے اور پھر کھینچ تان کر شعر کو نئے معنی پہنانا چاہے۔ سب شارحین پر اعتراض جڑے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ غالب سے میں نے اس شعر کے معنی پوچھے تو کہنے لگے کہ " اے بمعنی "مثل" پڑھو تو مطلب صاف ہے۔ حالی پر اعتراض کرنا ضرور تھا اور تو گنجائش نکلی نہیں جھٹ نہیں جھوٹا بنا ڈالا۔ لکھدیا کہ میرے نزدیک حالی نے اس شعر کے معنی غالب سے پوچھے ہی نہیں! تاریخی مضمون کا عنوان " چار مینار " سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔ تاریخ دکن حیدرآباد گزیٹیر تھوڑا اس سے اور تھوڑا اس سے لے کر ایک جگہ جمع کیا اور آنا فانا ایک تاریخی مضمون تیار ہو گیا۔ اس طرح تین گھنٹے میں چار پانچ مضمون تیار ہو گئے۔ رہی غزل تو یہ بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دادا مرحوم کی بیاض اٹھائی ایک پھڑکتی ہوئی غزل تلاش کی چند منٹ کی محنت سے تخلص بدلا اور "خیالات عالیہ" کے

یہ ہے وہ ادبیت اور شاعری جس پر ہم ابنائے وطن کی تعریف حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ ہم خوش ہمارے دوست احباب خوش لیکن ہمارا ضمیر؟ بے شک وہ مطمئن نہیں۔ میں پوچھتا ہوں "کیوں بھئی کیا میں ادیب نہیں؟" وہ کہتا ہے "نہیں ہرگز نہیں" اور واقعہ بھی یہی ہے ضمیر کی آواز جھوٹی نہیں۔ یہ ایک راز ہے آپ سے کہہ دیتا ہوں اور کہیں ذکر نہ کیجئے گا کہ درحقیقت میں ادیب نہیں!

یہی ادبیت ہے جس کے بل پر میں اپنے کو ادیب سمجھنے لگا ہوں ہی۔ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ میں ادیب نہیں اگر میں ادیب ہوتا تو شہرت اور بیجا ستائش کے شہد پر مکھی بن کر نہ گرتا۔ اگر میں ادیب ہوتا اِن غیر ذمہ دارانہ اور لچر تحریروں پر مطمئن نہ ہو جاتا۔ فطرت کی وسیع و عریض کتاب میرے سامنے کھلی ہوئی تھی میں اس کے معالعہ میں خو ہو جاتا۔ اپنی عمر صرف کر دیتا اور ادب نثر و نظم کے جواہر ریزے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ قصر گیتی کے بام و در ان ترانوں سے گونج اُٹھتے۔ تاریخ عالم کا بحر زخار میرے سامنے موجیں لے رہا تھا۔ اگر میں چاہتا تحقیق و تدقیق کی انتہائی چوٹیوں پر چڑھ کر ماہر غوطہ زن کی طرح اس بحر کی تہ میں اتر جاتا۔ بہزار جد و جہد آبدار موتی نکال لاتا کہ خواہ وہ تعداد میں زیادہ ہوتے مگر لوگوں کی آنکھوں سے غلط فہمیوں کے پردے اٹھا دیتے۔ شبلی و شرر کی روحیں قبر سے نعرۂ تحسین بلند کرتیں۔ اگر میں ادیب ہوتا تو جمال یار کا ایسا نقشہ کھینچتا کہ دنیا جمال معلوم ہوتی۔ کسی کی آنکھ کا تصور باندھتا تو کل کائنات آنکھ بن جاتی۔ فراق کا قصہ چھیڑتا تو دل ہل جاتے دنیا مجھ سے فائدہ اٹھاتی اور میں دنیا سے۔ اگر میں ادیب ہوتا تو حالی کو جھوٹا غالب کو گندم نما جو فروش نہ لکھتا۔ اور اگر لکھتا تو اُن دلائل سے لکھتا کہ دنیا پکار اُٹھتی "ہاں وہ جھوٹے اور مکار تھے"۔

غرض میں ادیب ہوتا تو میری نظر سطحیات سے گزر کر تہ پر پہنچتی۔ جو لکھتا تحقیق، ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے لکھتا۔ روزانہ نہیں سال میں آٹھ مضمون لکھتا لیکن وہ ادب کی جان ہوتے۔ کمیت میں حقیر اور کیفیت میں اعلیٰ ادب تیار کر کے چاہے دنیا کچھ ہی کہتی، میں یہی کہتا ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

شاعری و افلاس

(از)

محسن بن شبیر صاحب۔ بی اے۔ متعلم ال ال۔ بی

کیا شاعری منحوس ہے؟ ہندوستان میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ شاعری و افلاس لازم و ملزوم ہیں اور شعر گوئی کا قدرتی نتیجہ نحوست ہے۔ بہ الفاظِ دیگر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو شعر کہنے ہی سے آدمی منحوس ہو جاتا ہے یا کارخانۂ تقدیر سے شعر گوئی کا چسکہ اُسی کو پڑتا ہے جو آئندہ زندگی میں منحوس بننے والا ہوتا ہے۔ ایک حد تک اِس خیال کی تائید بعض نامی گرامی شعرا کی حالت اور اُن کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ اور بدنصیبی سے بعض نامور شعرا کے کلام نے جو مفلسی کا شکار ہو گئے تھے اس خیال کو اور بھی پختہ کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا اچھی باتوں کو بھول جاتی ہے اور بُری باتوں کو بہت یاد رکھتی ہے۔ جن شاعروں نے عیش و عشرت کی زندگی بسر کی لوگ اُن پر توجہ نہیں کرتے لیکن جن کو مصیبتوں نے گھیرا اُن کے ساتھ اب بھی دل و زبان سے ہمدردی کی جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ بعض سلاطین عظام شاعر گزرے ہیں۔ بہت سے نامور اُمرا کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ فارسی اور اُردو کے ہزاروں شاعر ایسے ہیں جو آسودگی و تمول کے اعتبار سے کسی اور طبقے کے افراد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ "خزانۂ عامرہ" میں تقریباً ایسے ڈیڑھ سو شاعروں کا ذکر کیا ہے جو گرانبہا صلہ و انعام سے مالا مال تھے اِن میں سے بعض کے منہ موتیوں سے بھر دیئے گئے تھے۔ ایک آدھ ایسا ہے جس کو ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی انعام میں ملی تھی۔

خود ہمارے زمانے میں خوانِ آصفی کے ریزہ چین اور بارگاہِ عثمانی کے وابستۂ دامن اعیانِ دولت و ارکانِ سلطنت، امرائے

کامگار و عہدہ داران ذی اقتدار ایسے ہیں جو شاعر بھی ہیں اور بفضل خدا و بتائید خداوندامیرانہ زندگی گزار رہے ہیں بہر حال یہ خیال کہ شاعری و افلاس میں چولی دامن کا ساتھ ہے قطعاً غلط ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر یہ خیال کیونکر پیدا ہو گیا کہ شعر گوئی و سخنوری سے اِنسان مفلس ہو جاتا ہے۔ میری رائے ناقص میں بعض وجوہ ایسے ہیں جن کے سبب سے عوام شاعری کو افلاس کا مترادف سمجھتے ہیں اور یہی خیال مدتوں سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ ناسخ کے ایک شاگرد آغا کلب حسین خاں نادر نے جو ڈپٹی کلکٹر (مددگار تعلقدار) تھے اس وہم کی تردید اس طرح کی ہے:۔

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

مگر اس پر بھی بعض لوگ شاعری کو منحوس ہی سمجھتے رہے اور کسی صاحب نے مذکورۂ بالا شعر کی تردید اس طرح کی:۔

لوگ سچ کہتے ہیں فنِ شاعری منحوس ہے
لاٹ ہوتا گر ڈپٹی کلکٹر رہ گیا

شاعری کو منحوس خیال کرنے کے مختلف وجوہ | اس مسئلہ پر زیادہ غور کرنے سے مجھے بھی بعض وجوہ ایسے نظر آتے ہیں جن کے باعث شاعری و مفلسی دو توام بہنیں سمجھی جانے لگیں۔

اول وجہ اُن شاعروں کا طرزِ عمل ہے جو کوئی نوکری چاکری یا کوئی دھندا نہ کرکے ہر وقت ہاتھ میں کاغذ پنسل لئے رہتے ہیں جن کو اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے قافیہ پیمائی کی دُھن لگی رہتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ باہمہ اور بے ہمہ نہیں ہوتے صرف شاعری کے پیچھے ہی اللہ لئے پھرتے ہیں اس سے اُن کے اسبابِ معیشت پر بھی اثر پڑ جاتا ہے اور وہ ہمہ تن نحوست بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اعتدال سے بڑھ جانے کی وجہ سے خود بھی دیوانے یا منحوس مشہور ہو جاتے ہیں اور شاعری کو بھی بدنام کرتے ہیں۔

دوسری وجہ شاعری کو منحوس سمجھنے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب فارسی شعرا میں مدحیہ قصیدہ گوئی کا رواج ہوا اور قصیدے کی تمہید یا تشبیب کے لئے منجملہ دوسرے مضامین کے نقلی و خود ستائی، شکوۂ آسمان، ناقدریٔ زمانہ، گلۂ تقدیر وغیرہ چند خاص موضوع مقرر کر دیئے گئے تو اس ضمن میں بعض شاعروں نے جو حقیقت میں مفلس و قلاش نہ تھے اپنے ممدوحوں کی رگِ سخاوت کو جوش میں لانے کے لئے اور اُسی سے خاطر خواہ انعام حاصل کرنے کے واسطے اپنی قابلیت کا اظہار اور زمانے کی ناقدری

کا شکوہ کردیا اور خلافِ واقعہ اپنے کو سخت مصیبت زدہ ظاہر کیا۔ ایسے قصائد کے سننے سے ممکن ہے کہ اُن کے زمانے میں بھی لوگوں کو اُن کی تکلیف کا تصور ہوا ہو لیکن اُن کے بعد تو یقیناً ان کی نمائشی اور بناوٹی حالتِ زار پر لوگوں کو ترس آنے لگا۔ اور اس قسم کے شاعروں کی نسبت یہ خیال گزرنے لگا کہ وہ بیچارے بڑی عسرت و فلاکت میں مبتلا تھے۔ اِس کی مثال میں حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر کا سچا واقعہ لکھ دینا بے محل نہ ہوگا۔

ایک صاحب جو اچھے شاعر ہیں سرکاری دفتر میں نوّے روپے کے ملازم ہیں۔ پچاس روپیہ اُن کو تاریخ گوئی وغیرہ کے صلہ میں بطور منصب بھی ملتا ہے۔ ایک بڑے امیر کے ہاں وہ معتمد خانگی ہیں وہاں سے بھی اُن کو سوا سو روپیہ ماہوار ملتی ہے۔ وہ ایک قصیدہ لکھکر اور فریم میں لگا کر ایک متقدر عہدہ دار کے ہاں پہنچے اور اُن کو نذر دیا۔ اس قصیدہ کی تمہید میں اپنی حالت کا انھوں نے ایسا دردناک نقشہ کھینچا تھا کہ وہ عہدہ دار بے حد متاثر ہوئے اور سمجھے کہ فقر و فاقہ نے اِس شاعر کا بُرا حال کر رکھا ہے وہ بہت ہی شرماتے شرماتے بیس روپیہ اُن کو دینے لگے۔ ہمارے شاعر نے اُس وقت فرمایا کہ مجھے روپئے کی ضرورت نہیں ہے آپ کی مہربانی سے میری آمدنی ڈھائی تین سو روپیے ماہانہ ہے۔ یہ تو صرف شاعری تھی۔ میری اصل غرض یہ ہے کہ آپ میرے سالے کو اپنے دفتر میں کوئی جگہ دیدیجئے۔

غرض کہ یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ شاعروں کی گریہ وزاری جو اُن کی زندگی میں بالکل بے موقع تھی امتدادِ زمانہ کے باعث حقیقت اور واقعہ تصور ہونے لگی۔ اور جب شعراء کے قصائد میں اِسی قسم کی مرثیہ خوانی بکثرت نظر آئی تو پڑھنے والوں کو یہی گمان ہونے لگا کہ جس شاعر کو دیکھو یہی رونا رو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوتا گیا کہ شاعر ہمیشہ بڑی مصیبت میں رہتے ہیں اور شاعری افلاس کی جڑ ہے۔ یہاں تک کہ آگے چل کر کسی شاعر کو آسودگی کی حالت میں دیکھنے پر تعجب ہونے لگا۔ چنانچہ دولت شاہ نے خواجہ ہمام الدین تبریزی مشہور شاعر کے حالات میں بڑی حیرت سے لکھا ہے کہ جب اُس نے صاحب دیوان شمس الدین کے فرزند خواجہ ہارون کی دعوت کی تو اُس کے دسترخوان پر چینی کے چار سو رکابیاں موجود تھیں اور تعجب کیا ہے کہ اگلے زمانے میں شاعر ایسے ایسے مال دار بھی ہوئے ہیں۔ اگر دولت شاہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ ایک معمولی شاعر کے دسترخوان پر دعوتوں میں چینی کی دو دو ہزار رکابیاں چُن دی جاتی ہیں۔

ایک تیسری بڑی وجہ شاعروں کو مفلس سمجھنے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اردو و فارسی کے بعض نامور شعرا حقیقت میں

بہت تنگدست گذرے ہیں۔ اور کبھی کبھی اُن پر ایسا وقت بھی آگیا ہے کہ وہ انتہائی افلاس میں زندگی کے دن بسر کرتے تھے۔

سعدی اور افلاس | اس قسم کے شاعروں میں حضرت سعدی کا نمبر اول ہے۔ دنیا کے تمام فارسی پڑھے ہوئے ان کے کلام سے مستفید ہوئے ہیں۔ ہر فارسی خواندہ کو اُن سے ایک خاص عقیدت ہے۔ گلستان و بوستان میں کئی مقام پر ان کے افلاس کا تذکرہ ہے جسے پڑھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ کبھی کوفے کی گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتے دکھائی دیتے ہیں کبھی قید فرنگ میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس دس روپئے نہیں کہ قید سے رہا ہوں۔ ایک وقت اُن پر ایسا آتا ہے کہ اُن کے پاس صرف چار آنے ہوتے ہیں اور وہ بصد حسرت اپنے ساتھی کو چھوڑ کر کشتی میں روتے ہوئے سوار ہوجاتے ہیں آخر عمر میں جب یہ سیاحت سے واپس آتے ہیں تو اپنی پریشان حالی یہ ایک قصیدہ میں صاحب دیوان شمس الدین کو ان لفظوں میں لکھتے ہیں۔

زروزگار بہ رنجم چنانکہ نتواں گفت
بہ خاک پائے خداوندِ روزگار یمین

خواجہ علاالدین حاکم عراق کو اپنا قصیدہ لکھتے وقت اِن کی فلاکت اور بڑھ گئی ہے :۔

اگر سفینۂ شعرم رواں شود چہ عجب | کہ می رود بہ سرم از تنور دل طوفان
تو کوہِ جودی و من درمیان ورطۂ فقر | گر بہ شرطۂ اقبالت او فتم بکران

انوری کی مصیبت | انوری قصیدے کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ اس کے بعض قصائد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تمام عمر بھی پریشانی ہی میں گزری ہے جس طرح یہ مصائب و آلام کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اُس کا ثبوت اس قطعے سے ملتا ہے جو زبان اُردو میں بھی ضرب المثل ہے۔

ہر بلائے کز آسمان آید | گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می گوید | خانۂ انوری کجا باشد

ظہیر فاریابی کا شکوہ | ظہیر فاریابی جو قصیدے کا بڑا استاد ہے اور انوری کی ٹکر کا یا اُس سے کم و بیش تصور کیا جاتا ہے اپنے اُس مشہور قصیدے میں جو قزل ارسلان کی مدح میں اُس نے لکھا ہے افلاس سے مجبور ہو کر بادشاہ کو

اس طرح طعنہ دیتا ہے :-

شاید اگر بعد خدمت سہ سالہ در عراق

نانم ہنوز خسرو مازندران دھد

یعنی کیا یہ مناسب ہے کہ تین برس سے میں تمہارے دروازے پر پڑا ہوا ہوں اور ابھی تک حاکم مازندران مجھے روٹی دے رہا ہے ۔

ابن یمین کی مفلسی | فارسی قطعہ گوئی کے مسلم الثبوت استاد ابن یمین کی تقریبًا ساری عمر روتے ہی گزری ۔ فرماتے ہیں :

محنت دوران و رنجوری و درویشی — فرقت احباب و تنہائی و غربت بر سری

این ہمہ بر من ز جور دور چرخ چنبری است — اے مسلمانان فغان از دور چرخ چنبری

یہ بیچارے گھر میں بھوکے رہتے ہیں مگر اپنا پوزیشن سنبھالنے کے لئے بازار میں جھوٹی ڈکاریں لیتے ہیں :

حالت از فقر و فاقہ است چنانکہ — نرسد نان بہ ترہ ۔ ترہ بہ دوغ

وز برائے رعایت ناموس — مے کشم بر گرسنگی آروغ

منجملہ دوسرے ممدوحین کے طغا تیمور خاں حاکم مازندران بھی اُن کا کسی وقت میں سرپرست تھا مگر وہ کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ کھاتے کیا مٹی ہو ؟ لاجواب قطعہ ہے ۔ ملاحظہ ہو :-

یارب چہ موجب است کہ روزے نگفت شاہ — کابن یمین بیدل شیدا چہ می خورد

چون ہر چہ داشت رفت بتاراج حادثات — وز ما نیافت ہیچ پس آیا چہ می خورد

با شد ملازم در ما ہمچو آستان — جز خاک این جناب معلی چہ می خورد

افلاس کے پانچ پہلو | اس قسم کے مفلس شاعروں میں سے ایک شخص نے اپنے افلاس کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ باید و شاید اس کے لڑکے نے اس سے کچھ روپئے مانگے تھے جس کا یہ جواب دیا ۔

بابا مگر تو سفرۂ بے نان ندیدۂ — جنگ عیان و گریۂ طفلان نہ دیدۂ

ننشستہ گوشۂ از بیم قرضخواہ — تاکہ ز در در آمد مہمان ندیدۂ

میر صاحب کی ضعف نالی | اردو کے مفلس استادوں میں میر صاحب قبلہ نمبر ایک ہیں۔ اگرچہ بعض وقت بظاہر اُن کی حالت اچھی بھی دکھائی دیتی ہے اور وہ معقول تنخواہ کے ملازم بھی ہو جاتے ہیں مگر وہ خود یہ فرماتے ہیں :۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دِل

انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کے افلاس کا فوٹو ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں گئے پریشان گئے۔ جہاں رہے پریشان رہے۔ مثلاً

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

آگرے سے دہلی پہنچے۔ اب دہلی میں بھی اُن کے سرگشت ملاحظہ فرمائیے :۔

دلی میں بے ولا نہ پھرایا میرے تئیں
کاماسے تلخ کام اُٹھایا میرے تئیں

میر صاحب کے کئی مخمس ایسے ہیں جن میں ان کی فلاکت کے سمے نظر آتے ہیں اور بڑا رنج ہوتا ہے کہ ایسا صاحب کمال اور ایسا پریشان۔ ایک مخمس میں خود انھوں نے اپنی حالت کی تصویر ان الفاظ میں دکھائی ہے :۔

حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ دل آتشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ ہے نام مجلسوں میں میرا میر بد دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

سودا کی بے روزگاری | سودا نے جو دو شہر آشوب لکھے ہیں وہ اُن کی حالت کے دو آئینے ہیں۔ اُس زمانے میں ملازمت حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک گھوڑا خرید کر کسی راجہ یا نواب کے ہاں چلے جاتے تھے اور سواروں میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ ملک الشعرا سودا کو یہ نوکری بھی نہیں مل سکتی۔ فرماتے ہیں :۔

کہا میں نے سودا سے اک روز کیوں تو ڈانوا ڈولی پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لیکے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول اگر کہوں گا تو سمجھیگا تو کہ ہے یہ ٹھٹول

بتا کہ نوکری بجتی ہے ڈھیسریوں یا تول ؟

ایک قصیدے میں فکرِ معاش سے مایوس ہو کر فرماتے ہیں :-

یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغہ حشر

آسودگی حرفیست۔ یہاں ہے نہ وہاں ہے

مصحفی کی تنگدستی | اردو کے مشہور شاعروں میں سب سے زیادہ افسوسناک حالت مصحفی کی نظر آتی ہے۔ یہ غریب قحط زدہ لوگوں کی طرح اپنے بچوں کو فروخت کرنے پر مجبور رہتے۔ مختلف پرچوں پر یہ مشاعرہ کی طرح پر شعر کہکر لکھ لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے شوقین آٹھ دس آنہ روپے بارہ آنے تک اچھے اچھے شعر چھانٹ کر غزل بنا کر لیجاتے تھے۔ تخلص خریدار کا ڈالدیا جاتا تھا۔ بچے کھچے شعر مصحفی کے حصے میں آتے تھے جن پر بعض وقت کوئی داد بھی نہیں دیتا تھا۔

مصحفی شہزادے مرزا سلیمان شکوہ کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ اُن کے پاس سے کچھ تنخواہ ان کو ملا کرتی تھی جب سید انشا وہاں پہنچے تو شہزادے صاحب اُن کو اپنا کلام دکھانے لگے اور مصحفی کی تنخواہ میں کچھ تخفیف کر دی جس پر انھوں نے ایک معروضہ پیش کیا۔ اِس نظم کو پڑھئے اور خدا کا شکر کیجیے۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق

ہے، وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہوئے ہیں ہم بھی تھے کسی وقت میں پچیس کے لائق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو در ماہہ کہ سائیس کے لائق

انشا کا دردناک انجام | انشا کی آخری عمر کے افلاس کے جو مناظر شمس العلماء آزاد نے آبِ حیات میں دکھائے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو ان کے بعد عبرت کے لئے کسی اور آئینہ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ توضیحاً سعادت یار خاں رنگین کی انشاء سے چوتھی ملاقات کی کیفیت نقل کی جاتی ہے۔ سعادت یار خاں کہتے ہیں :-

"چوتھی مرتبہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اڑتی ہے اور کتے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی ؟ (وہ اُن

کی بی بی تھیں) میاں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائی درجہ کا اتحاد تھا اُس ضعیفہ نے پہچانا۔ دروازے پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھیا اُن کی تو عجب حالت ہے۔ اِسے تو میں ہٹ جاتی ہوں تم اندر آؤ اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے آگے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھتے تھے۔ وہ گرم جوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتیں تھیں یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا سید انشا۔ سید انشا۔ سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھ پر آنسو ہیں۔ میں نے کہا کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے۔ پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔"

ہجو کا صلہ | انشا کے زمانے کے ایک مفلس شاعر فایق نے فقرو فاقے سے تنگ آکر اُن کی ہجو کہی تھی انھوں نے پانچ روپے سے اُس کا منہ اِس طرح مار دیا۔

فایق بیحیا چو ہجوم گفت — دل من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم — دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

جرات کی بینوائی | جرأت بھی جن کو انشا نے "ہندوستان کا شاعر" کہا ہے شاہ نصیر کی طرح اکثر رہے ہیں اور نواب محبت خاں کے مختار کو یوں صلواتیں سنا رہے ہیں :-

مختاری پہ کچھ آپ نہ کیجئے گا گھمنڈ — کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیج انڈ
سرمائی دلا دیجئے ہماری ورنہ — تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائینگے ٹھنڈ

جب لکھنؤ میں جرأت مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے وہاں بھی کسی وقت تنخواہ بند ہوئی اور اُن کو کہنا پڑا :-

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
جبکہ اللہ ہی نہ دیوے تو سلیمان کب دے

شاہ نصیر پر سردی کا حملہ | شاہ نصیر جو ذوق کے بھی استاد ہیں اور ہمارے حیدرآباد میں حضرت شاہ

موسی قادری کے احاطے میں آرام فرما رہے ہیں جن دنوں دہلی میں تھے شاہِ عالم سے جڑاول (سرمائی لباس) کی فرمائش اِس طرح کرتے ہیں۔

بچائے گا تو ہی اے میرے اللہ | کہ جاڑے سے پڑا بیڈھب ہے پالا
پناہِ آفتابؔ اب مجھکو بس ہے | اُڑھائے گا وہی مجھکو دوشالا

ذوق کی آشفتہ حالی | زبانِ اردو کے بعض اور استادوں میں بھی کسی نہ کسی وقت افلاس کا دَور دورہ رہا ہے مثلاً ذوق ابتدا میں ساٹھ روپیہ ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ آخر میں دو سو روپیہ تنخواہ بھی ہوگئی تھی مگر یہ کس کی تنخواہ ہے؟ ملک الشعراء خاقانی ہند کی۔ ذوق کی پریشان حالی کا یہ شعر بہترین شاہد ہے:۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے۔ تجھ پر۔ کمال افسوس ہے

نظیر اکبرآبادی کی تنخواہ | نظیر اکبرآبادی جن کے قدردانوں کا دائرہ اب روز بروز بڑھتا جارہا ہے ایک خانگی مکتب میں سترہ روپیہ مہینے پر پڑھاتے تھے۔

غالب کی شہ خرچی و افلاس | اِس قسم کے شعراء میں حضرتِ غالب سب کے صدر نشین ہیں۔ اگرچہ اُن کے علم و فضل کے اعتبار سے اُن کی کسی وقت بھی قدر نہ ہوئی پھر بھی آخر وقت میں اُن کی مجموعی آمدنی کچھ اوپر دو سو روپیہ ماہانہ تھی۔ مگر ان کے اخراجات کے مقابلہ میں محض ناکافی تھی۔ اِسی وجہ سے انہوں نے اپنے خطوط و اشعار وغیرہ میں جا بجا اپنی تکلیف کا اظہار کیا ہے۔ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ دہلی کے آخری تاجدار کی سرکار سے جو اُن کو پچاس روپیہ ماہوار ششماہی کی ششماہی ملا کرتی تھی اُس سے بھی اُن کے حساب میں بڑی کھنڈت پڑتی رہتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ماہ بماہ ایصال تنخواہ کے لئے ایک معروضہ پیش کیا۔ جو بسبب شہرت محتاج اعادہ نہیں ہے۔ یاد دلانے کے لئے دو تین شعر لکھدیئے جاتے ہیں۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھکو نہیں | ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر | جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

آپ کا بندہ اور پھرے ننگا　　آپ کا نوکر اور کھائے ادھار

عبید اور تمسخر | مفلس شاعروں میں فارسی کا مشہور ہزل گو شاعر عبید زاکانی جس کی کتاب "موش و گربہ" عثمانیہ یونیورسٹی کے ایف۔ اے کے نصاب میں ہے بڑا فاضل اور اچھا شاعر تھا مگر مفلسی نے اس کو ایسا ستایا کہ اس نے متانت و سنجیدگی کو سلام کر کے مسخرے پن پر کمر باندھلی۔ ایک نظم میں اس نے اپنی قرضداری کی یہ کیفیت لکھی ہے:

ہر کس بہ عیش شاغل و من در بلائے قرض　　مردم بہ عیش خوشدل و من مبتلائے قرض

در شہر قرض دارم و اندر محلہ نیز　　در کوچہ قرض دارم و اندر سرائے قرض

از بسکہ خواستم زدرِ ہر گدائے قرض　　عرضم چو آبروئے گدایاں بباد رفت

دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر ناٹک میں شریک ہو جاؤ۔

کاندر طلبِ راتبِ ہر روز بمانی　　اے خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم

تا گنجِ زر از کہتر و مہتر بستانی　　رو۔ مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز

شاعروں کے مفلس مشہور ہو جانے کی ایک وجہ اور معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ بعض شاعر معقول آمدنی رکھتے تھے مگر اپنے اخراجاتِ کثیر اور شہ خرچ ہونے کے سبب سے وہ آمدنی اُن کو کافی نہیں ہوتی تھی اور مجبوراً اُن کو اپنے ممدوح سے اس قسم کی گزارش کرنی پڑتی تھی جو کسی مفلس و قلاش کو کرنی چاہیئے۔

ایک شاعر کا تمسک | میں اس قسم کے شعرا میں سے جو حقیقت میں محتاج نہ تھے ایک شاعر شمس الدین طبسی کا ذکر کر کے اپنا مضمون ختم کر دیتا ہوں۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں اِن کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"یہ باوجود فضل و کمال کے شاعری میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اور مشہور آفاق وزیر نظام الملک طوسی کے مصاحب تھے۔ اس کی مدح میں انھوں نے بڑے بڑے قصائد لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی طرف بھی مفلسی کا پھیرا ہو گیا تھا انھوں نے وزیر موصوف سے ایک ہزار دینار قرض لئے اور حسبِ ذیل تمسک لکھدیا۔"

(تذکرہ طبقۂ سوم صفحہ ۴۲)

یہ تمسک بہت ہی ظریفانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ اس میں جابجا آیات قرآنی بھی بڑے مزے سے تحریر کی ہیں میں بہاں تمسک کا مطلب خیز اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اصل تمسک میں جن جن مقامات پر قرآنی آیتیں آئی ہیں اُن کو ترجمہ میں اعراب نقل کے درمیان لکھدیا گیا ہے:۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے "خدا کو قرض دو مگر بلا سودی قرضہ"

اس حکم کی تعمیل میں صاحبان نعمت وارباب ہمت ہمیشہ انعام واکرام سے اہل اللہ کی مدد فرماتے رہے ہیں چنانچہ مخدوم معظم سلطان الوزرا خواجہ نظام الملک مہتمم خزانہ سخاوکرم نے اللہ تعالیٰ اُس کی دولت قاہرہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے اور اُس کے دربار گہربار کو قائم رکھے مبلغ ایک ہزار دینار نقروی سکہ رائج الوقت کاتب حروف مفلس نادار شمس الدین طبسی کو بھی قرض دیئے ہیں۔ اور مِن مقر مبلغ مذکور اپنے قبضہ وتصرف میں لایا ہے۔ اگرچہ رقم مذکور کی ادائی حسب وعدہ "اُس کا معاوضہ دو چند ہوگا" خدائے عزوجل کے ذمہ ہے۔ تاہم مِن مُقر اُس کو اپنے ذمہ لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ایک قطعہ باغ بہشت نظیر واقع بلدۂ "طیبۂ ملاقۂ رب قدیر" محدودۂ ذیل تمام وکمال رہن دکفول کرتا ہے کیفیت اس باغ کی یہ ہے کہ اس کے درختوں کی "جڑیں زمین کے اندر ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچ گئی ہیں" اس کے "ایک پودے میں سات سات بالیں اور ہر بال میں سو سو دانے لگتے ہیں" اور ہر دانہ "مثل روشن ستارے کے ہے" اس کا کنواں "لبالب کٹورا ہے" اس کا دروازہ ایسا کہ "داخل ہو جاؤ سلامتی وامن کے ساتھ" اور اس کی پیمائش یہ ہے کہ اس کا عرض "زمین وآسمان کے عرض کے برابر ہے" اقرار کرتا ہوں اور لکھدیتا ہوں کہ باغ مذکورہ مرتہن صاحب کے پاس رہن رکھکر مِن مقر بعنوان اجارہ مرتہن صاحب موصوف سے کرایہ پر لیکر اپنے قبضہ اور تصرف میں لایا ہے۔ مرتہن صاحب موصوف کا چونکہ مِن مُقر پر "اجر عظیم" ہے لہذا عند المطالبہ کہ "اے نفس مطمئن اب اپنے خدا کی طرف خوشی خوشی رجوع ہو جا" سال کے سال نظم گہر سلک قصائد کے پچاس عدد ہار کہ ہر ایک ان میں کا اشعار حکمت آمیز کی ایسی لڑی ہوگی کہ اگر ان کو پہاڑ کے سامنے پڑھا جائے تو وہ بھی خدا کے خوف سے خضوع وخشوع میں آجائے" مرتہن صاحب موصوف کے پاس بلا عذر وحیلہ ہا نہ پہنچایا کروں گا فقط

گواہ شد

"اللہ گواہ کافی ہے"

ملٹن اور تقشف

(از)

میر حسن صاحب بی۔اے (عثمانیہ) طالب سال ششم

دورِ تقشّف

جو لوگ سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے سرکاری کلیساؤں کے مخالف ہو گئے تھے انہیں متقشفین Puritans کہا جاتا ہے۔ متقشفین نے شخصی راست بازی، راست کرداری اور مذہبی حریت جوش میں غلو سے کام لیکر انگریزوں کے اخلاق اور طرزِ معاشرت کو نہایت سخت اور صد درجہ خشک اصولوں اور نظریوں میں جکڑ دیا تھا۔ اسی لئے انہیں اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابتدائً یعنے شکسپیئر کے عہد کے اوائل میں تقشف Puritanism اور متقشفین جیسے الفاظ کے استعمال سے اظہارِ تنفر بھی مقصود ہوتا تھا لیکن اب اِن کا مفہوم صرف بیانیہ رہ گیا ہے۔ چارلس اول کے زمانہ میں انگلستان کے اوسط طبقوں میں اس جماعت کی انتہا پسند ذہنیت پوری طرح سرایت کر چکی تھی، لیکن ایک زبردست قومی قوت کی حیثیت اس کو جیمس اول کے عہد تک حاصل نہ ہو سکی۔ پھر گوناگون وجوہات کی بنا پر اس کے زور میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ اعلیٰ طبقہ کی عیش پسندی اور تن آسانیوں نے سنجیدہ اصحاب کو تقشّف کا گرویدہ بنا دیا۔ اس طرح اس کا اخلاقی اور سماجی اثر اور بھی بڑھتا گیا۔ متقشفین صرف خدا کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھتے تھے۔ شاہ چارلس نے عوام کے حقوق اور آزادی کو سلب

بگڑنا چاہا تو انھوں نے نہایت زبردست صدائے احتجاج بلند کی اور اس سماجی اور اخلاقی تحریک نے بالآخر سیاسی شکل اختیار کرکے ایک نہایت نازک موقع پر انگریزوں کی انفرادی آزادی کو حکومت کے دست برد سے بچا لیا۔ خانہ جنگی کی طوفان خیزی کے بعد کرامول کی کامیابی کی وجہ سے تقشف کو زبردست فروغ حاصل ہوا، جس کے اثرات دولتِ عامّہ کے چند ہی سالوں میں ہمہ گیر ہو گئے۔ اپنے محدود حلقہ میں تقشف نے انگریزوں کی طرزِ معاشرت اور طریقِ تخیل کو بہت متاثر کیا، اس نے جو رجحانِ ادب اور زندگی میں پیدا کیا وہ باوجود اپنے محدود محاسن کے نہایت خشک اور ایک حد تک ناقابلِ برداشت بھی تھا۔ متقشفین کی پاک باطنی، خدا ترسی، دیانت داری اور راست بازی قابلِ قدر ہے۔
لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن کی تنگ خیالی، تعصب، کٹرپن، اور حُزن پسندی پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ ان کو سائنس، فنون اور جمالیات سے نفرت تھی۔ تقشف نے انسانی تمدن کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ اور ادبیات کو اپنے مخصوص مقاصد کا تابع بنانا چاہا۔ اس کا وجود نہ صرف فنونِ لطیفہ کے لئے بلکہ ادبیات کے لئے بھی موت کا پیام ثابت ہوا۔ عام طور پر متقشفین نہایت متعصب قسم کے لوگ سمجھے جاتے ہیں، لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ یہ خیال ایک حد تک بے بنیاد ہے ہیمپڈن اور ٹامس ہکر کے علاوہ کرامول بھی متقشف تھا جس کی مذہبی رواداری ایک کھلی حقیقت ہے۔ اس تحریک سے متعلق غلط فہمیوں کے پھیلنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ برسرِ اقتدار آتے ہی کرامول نے مختلف قوانین نافذ کرکے عوام کے بہترے دلچسپ مشاغل کو ممنوع قرار دیا جس کی وجہ سے وہ ایک خشک معیارِ زندگی کے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن صرف اس بناء پر پوری تحریک کی مخالفت کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ کسی زبردست دریا کے فیضان کا اندازہ اُس کف سے نہیں کیا جاتا جو اُس کی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس لئے صرف بعض کمزوریوں کی بنا پر، جن کی حیثیت کف ہی کی سی ہے دریائے تقشف کے فیضان سے انکار کرنا عقلمندی نہیں۔ اس تحریک نے سیلابِ حیات بن کر نسلوں کو سیراب کیا اور تقریباً نصف صدی کے اندر انگلستان کی ذہنی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس عہد میں ایک آدھ ہی مصنف ایسا ملتا ہے جس نے تقشف کے جملہ مقاصد کو اپنے اندر جذب کرکے قدم آگے نہ بڑھائے ہوں۔ سب سے اہم مثال ملٹن کی ہے۔ وہ اس تحریک کی اہم ترین پیداوار تھا۔ اس کے ادبی کارناموں میں تقشف کے سماجی اور اخلاقی معتقدات کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے وسیع اثرات کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

۲

جان ملٹن

جان ملٹن ۹ ر دسمبر ۱۶۰۸ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ تقشفی رجحانات کے باوجود اُس کے باپ کو ادبیات اور حسن کاری سے خاصا لگاؤ تھا۔ یہی خصوصیات بیٹے کو ورثہ میں ملیں۔ ملٹن کی تعلیم سینٹ پال سکول اور پھر کرائسٹ کالج کیمبرج میں ہوئی۔ یہاں سات سال زیر تعلیم رہ کر اُس نے بی۔ اے کی سند ۱۶۲۹ء اور ایم۔ اے کی سند ۱۶۳۲ء میں حاصل کی۔ ملٹن کا مطالعہ نصابی کتابوں تک محدود نہ تھا اور جب اُس نے معلوم کیا کہ مذہبی تعلیم اس کی افتادِ طبیعت کے خلاف تھی تو کلیسا کی خدمت کا خیال ترک کر کے اپنی تمام تر توجہ مختلف علوم کی تحصیل اور شعر و شاعری کی طرف مرکوز کر دی۔ خاندان کی مالی حالت اچھی تھی اس لئے معاش کی فکر دامن گیر نہ ہوئی، اور جامعاتی تعلیم کی تکمیل کے بعد ملٹن نے اپنے گھر ہارٹن میں سکونت اختیار کی، جو لندن سے کوئی ۱۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ایک موقع پر خود ملٹن نے بیان کیا ہے کہ وہ لڑکپن ہی میں راتوں میں دیر دیر تک مطالعہ کرنے کا عادی تھا، جامعاتی تعلیم کے دوران میں بھی اُسے کتابوں اور مطالعہ سے ایسا ہی عشق رہا۔ اس چھ سال کی تنہائی میں اپنے محبوب مشغلہ کو پورے انہماک کے ساتھ اُسنے جاری رکھا۔ یونانی، لاطینی، عبرانی، ہسپانوی، فرانسیسی، اطالوی، اور انگریزی ادبیات کے ساتھ ساتھ ریاضی، سائنس اور دینیات کا بھی مطالعہ کیا بنیادیں پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں جامعاتی تعلیم کے بعد مزید مطالعہ نے ملٹن کو علامہ زماں بنا دیا۔ ملٹن کو نہ صرف اپنے علم کی وسعت و صحت کے لحاظ سے تمام انگریزی شاعروں میں امتیاز حاصل ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس کے تبحر علمی کی ضیا پاشیوں نے اس کی نظموں کی لطافت اور کیف انگیزی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مختلف ممالک کے حالات سے راست واقفیت حاصل کرنے اور تجربہ کے ذریعہ تعلیم کو مکمل کرنے کی غرض سے تیس سال کی عمر میں ملٹن سفر پر روانہ ہوا۔ پیرس کی سیر کے بعد اٹلی پہنچا تو انگلستان کی داخلی ابتری کی اطلاع ملی، اور واپسی پر مجبور ہوا، چنانچہ ملٹن نے ایک موقع پر لکھا ہے "جب میں نے اپنے ہم وطنوں کو حریت اور آزادی کی کشمکش میں مبتلا دیکھا، تو خیال کیا کہ ایسے وقت میں وطن سے دور آرام اور فراغت سے زندگی بسر کرنا مناسب نہیں۔" اس لئے یورپ میں تقریباً پندرہ مہینے گزارنے کے بعد ۱۶۳۹ء میں لندن واپس ہوا۔ اور شاہ پسندوں کے خلاف مختلف مضامین لکھکر بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ دولت عامہ کے قیام کے بعد ملٹن کو امور خارجہ کی کمیٹی کا لاطینی معتمد

بنا دیا گیا۔ ۱۶۴۳ء میں اس نے ایک نو عمر لڑکی میری پاول سے شادی کرلی۔ از دواجی زندگی بڑی تلخ رہی۔ ۱۶۵۲ء کے اوائل میں ایک قیامت خیز حادثہ پیش آیا یعنے ملٹن کی بصارت جو ایک عرصے سے گھٹتی جارہی تھی کثرتِ کار کی وجہ سے بالکل زائل ہوگئی۔ تین سال بعد اُس نے دوسری شادی کی لیکن بیوی پندرہ مہینے کے اندر ہی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ عود شاہی کے ساتھ ہی ملٹن کو گرفتار کرلیا گیا اور اس کی دو کتابیں منظرِ عام پر نذرِ آتش کردی گئیں۔ رہائی بہت جلد نصیب ہوئی لیکن اس کے بعد وہ ایک سیاسی گمنامی کا شکار ہو گیا۔ اُس کی زندگی مفلسی اور تنہائی میں کٹنے لگی۔ بے بصری کی مصیبت اس پر مستزاد تھی۔ اس مقصد کی ناکامی کی تلخیاں جس کے لئے اُس نے تمام عمر محنت اور قربانیاں کی تھیں۔ اب پوری طرح محسوس ہونے لگیں۔ پہلی بیوی سے جو لڑکیاں تھیں اُنھوں نے ملٹن کے حزن و ملال میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس تاریک اور اندوہناک زمانہ میں اس کی توجہ شاعری کی طرف مبذول ہوئی اور اُس نے پیراڈائس لاسٹ (فردوس گم کردہ) لکھی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں کئی سال قبل ہی قائم ہوچکا تھا۔ یہ بلند پایہ رزمیہ نظم ۱۶۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۶۷۱ء میں پیراڈائس ری گینڈ **Paradise Regained** اور سامسن اگونس ٹیز **Samson Aconistis** دونوں ایک ساتھ شائع ہوئیں تین سال بعد ۱۶۷۴ء میں ملٹن کا انتقال ہوگیا۔

ابتدائی نظمیں

ملٹن کی ادبی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جس سے اُس کی سخن گوئی اور ذہنی اور دماغی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

(الف) کلیہ کا زمانہ جو کیمبرج کی طالب علمی کے اختتام پر یعنی ۱۶۳۲ء میں ختم ہوتا ہے۔

(ب)۔ ہارٹن کا زمانہ جس کا اختتام ۱۶۳۹ء میں ہوتا ہے جب کہ ملٹن نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔

(ج) ۱۶۴۰ء سے ۱۶۶۰ء تک ملٹن نے مختلف موضوعات پر نثری مضامین اور کتابیں لکھیں۔

(د) بعد کی نظموں یا اظہارِ کمال کا زمانہ۔

جامعاتی تعلیم کے دوران میں ملٹن نے متعدد انگریزی اور لاطینی نظمیں لکھیں جو غیر اہم ہیں لیکن اس سلسلہ میں

اُس قصیدہ کو استثنائی حیثیت حاصل ہے جس کا عنوان "اوڈ آن دی مارننگ آف کرائسٹز نیٹیویٹی (ولادت مسیح کی صبح) ہے۔ اُسلوب کی ناہمواری اور بعض دوسرے معائب کے باوجود یہ نظم ایک نو عمر شاعر کے لئے یقیناً غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ہارٹن کے قیام کے زمانہ میں، اُس نے حسب ذیل تین نظمیں لکھیں جو اس قدر بلند پایہ ہیں کہ اگر پیراڈائس لاسٹ نہ لکھی جاتی تو بھی ملٹن کو انگریزی کے ممتاز ترین شاعروں کی اولین صف میں جگہ مل جاتی۔

لالہ گرو　　L'Allegro

ال پنسیروسو　　Il Penseroso

لسیڈس　　Lycidas

یہ تینوں نظمیں بڑی لطیف اور دلچسپ ہیں، ان کا مطالعہ اگر اسی ترتیب سے کیا جائے جس میں وہ لکھی گئی ہیں تو ملٹن کے دماغی ارتقا کے مدارج واضح ہو جاتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ملٹن کی تحریروں میں تقشف کے سماجی اور اخلاقی اثرات کے ساتھ ساتھ نشاۃ ثانیہ کی وسعت نظر اور آزاد خیالی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اسی آمیزش نے اُس کے بہترین ادبی کارناموں میں پاکیزگی اور لطافت کی ایک نرالی شان پیدا کر دی ہے۔ ابتدائی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملٹن کی شاعری کا آغاز نشاۃ ثانیہ کے علوم اور حسن کاری کے الہامی اثرات کے تحت ہوا۔ تقشف کا اثر پہلے پہل برائے نام تھا جس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آخر کار اپنے غیر معمولی تعمق اور گہرائی کی مدد سے اُس نے تمام دوسرے عناصر پر پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا" لالہ گرو میں انگلستان کے پُر فضا میدانوں اور مرغزاروں کے دلکشا مناظر سحری پیش کئے گئے ہیں۔ ہوا میں لطافت ہے، طیور زمزمہ سنجی کر رہے ہیں۔ فضا کی جاں نوازی، فطرت کی دلکشی، راگوں کے ترنم اور خوشبوؤں کے تعطر کی وجہ سے شاعر کے حواس خمسہ پر ایک بے خودی اور سرمستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تنویر صبح کے فیض سے کائنات کی ہر ادا میں سحر کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور پھولوں کے نکھار، شاخوں کے رقص اور طیور کے تموج آفرین ترنم میں حیات انسانی کے علامات نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں تقشف کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ملٹن نے سرخوشی اور سرشاری کے عالم میں رومانی مسرتوں، دیہی کھیلوں، تھیٹر کی نشاط انگیزیوں، اور موسیقی اور عمارت سازی کے حسن اور رعنائیوں کے مرقعے نہایت موزوں اور دلکش الفاظ اور انداز میں پیش کئے ہیں۔

ال پنسیروسو میں انہیں مناظر کی شام کا بیان ہے۔ ہوا میں وہی طراوت اور نعطر موجود ہے لیکن مسرت کی ولولہ انگیزیوں کی وہ شان اب رخصت ہو چکی ہے لیکن اس کے اثرات ابھی باقی ہیں۔ انبساط کی موجوں کا تلاطم سکون سے بدل گیا ہے۔ خاموش فضاؤں پر بے خودی سی چھائی ہوئی ہے۔ مسرت کے پرجوش احساسات کی جگہ اب غور وفکر اور تفکر و تجسس نے لے لی ہے۔ تمام فضائیں جمال غم سے معمور ہیں۔ اس وقت کا سکوت باوجود اپنی ظاہری غم انگیزیوں کے دلربائی اور دلنوازی کی ایک نرالی شان لیئے ہوئے ہے۔ شام کی بشاشتیں افق کی روشنی میں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ ایک نقاد کہتا ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں نظموں کے محاسن اور شعریت سے پورا پورا لطف اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی روز صبح میں لالہ گرو اور شام میں ال پنسیروسو کا مطالعہ لیا جائے۔ کومس Comus میں ہم ملٹن کی شاعری کو ایک اور دَور میں سے گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں جن پر تقشف کے اخلاقی اثرات مستوی نظر آتے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے کومس کا تعلق نشاۃ ثانیہ سے ہے اور قدیم ڈرامہ کی اس صنف کی جس کو نقابہ Masque کہتے ہیں یہ ایک نہایت مکمل اور جامع مثال ہے۔ نشرفا اور درباری حلقوں میں اس صنف کو ایک عرصہ تک بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ لیکن متقشفین ڈرامہ، اداکاری اور اسٹیج سے ہمیشہ متنفر رہے۔ اپنے ڈرامہ میں ملٹن نے مختلف اخلاقی رموز اور نکات کے حل کرنے کی مستقل کوشش کی ہے۔

ایک عورت کا جنگل میں رستہ گم کر دینا' کومس اور اُس کے اوباش ساتھیوں کا فریب اور ایک موکل کی مدد سے اُن اوباشوں کے چنگل سے اس راہ گم کردہ عورت کی رہائی وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ یہ ایک پرانی تمثیل ہے جس کا مقصد نیکی اور نفس پرستی کی کشمکش اور غیبی امداد کے ذریعہ سے اول الذکر کی کامیابی کا اظہار تھا۔

لیسی ڈس Lycidas ایک شبانی مرثیہ ہے جو ملٹن نے اپنے کالج کے ہم سبق ایڈورڈ کنگ کی موت پر لکھا تھا۔ اس کا طرز ادا اور اسلوب وہی ہے جو قدیم یونانی نظموں میں رائج تھا۔ گرجا کی ابتری اور پادریوں کی بدعنوانیوں کا ذکر ملٹن کے تقشف کا بین ثبوت ہے۔ ابتدائی نظموں سے اگر ایک طرف ملٹن کے مذہبی تخیلات کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس نے متقشفین کے فلسفۂ حیات و اخلاق کی تشریح و توضیح کی تزئین کی خاطر نشاۃ ثانیہ کے علوم اور آرٹ سے کس حد تک استمداد کیا۔

نثری تحریریں

یورپ سے انگلستان واپس ہونے کے بعد ملٹن نے اپنے آپ کو ملک کے سیاسی بکھیڑوں میں اُلجھا دیا اور اس طرح خود اسی کے قول کے مطابق ایک ایسے پرشور بحری سفر پر روانہ ہوا جس میں ہر ہر قدم پر طوفان خیزیوں اور شور انگیزیوں کا سامنا رہا۔ ایک طویل رزمیہ نظم لکھنے کا خیال ملٹن کے دل میں اس سے قبل ہی پیدا ہو چکا تھا لیکن یک سوئی اور سکون کے فقدان کی وجہ سے اُس نے اپنی توجہ شعر کی طرف سے بالکل ہٹالی اور آئندہ بیس سال تک صرف نثر لکھتا رہا جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ ملٹن جیسے وحید عصر شاعر کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ سیاسی اور ملکی مسائل کے سنوارنے میں صرف ہوا تو ادب اور شاعری کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ملٹن کے نثری کارنامے نہ تو آج ہمیں دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور نہ اُن کے مطالعہ سے کوئی حظ حاصل ہوتا ہے گو بعض مقامات پر اس کے اسلوب میں لطافت اور سادگی بھی آگئی ہے۔ (خود ملٹن لکھتا ہے کہ نثر نویسی اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جس میں سیدھے ہاتھ کا کمال نہ تھا) اس کے طویل جملوں پیچ در پیچ ترکیبوں اور طرز ادا کی خصوصیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس زمانہ میں جدید نثر انگریزی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ ان مقالوں میں صرف اریوپگیٹیکا **Areofagetica** کو اہمیت حاصل ہے۔ ملٹن کے زمانے میں انگلستان میں ایک ایسا قانون نافذ تھا جس کے لحاظ سے کسی کتاب کی اشاعت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ احتسابی کمیٹی اس کی اجازت نہ دے محتسب کو ادبیات کی لطافتوں سے زیادہ بادشاہوں اور پادریوں کے حفظ مراتب کا خیال رہتا تھا بہترین کتابوں کی اشاعت صرف اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ارباب اقتدار کو خوش کرنے سے قاصر تھیں۔ ملٹن نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تقریر اور تحریر کی آزادی کی پرجوش حمایت کی بقول ہڈسن یہ مقالہ اس قابل ہے کہ ذہنی آزادی اور ادبیات کے تمام پرستار اس کا مطالعہ کریں۔

آخری دور کی شاعری

جس عظیم الشان نظم کے سرانجام کرنے کے خیال نے ملٹن کو ایک عرصہ سے بے چین کر رکھا تھا اس کی تکمیل کا موقعہ

اسی وقت مل سکا جبکہ مودشاہی نے اُسے تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ پیراڈائز لاسٹ (فردوس گم کردہ) انگریزی زبان کی باعظمت ترین نظم ہے اس نظم کا موضوع کوئی خاص شخص یا ہیرو نہیں بلکہ یہ نوع انسان کی داستان ہے۔ تخلیقی استعداد اور ذہنی اور دماغی قوت کے اس اہتمم بالشان شہ کار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملٹن کے کمال کے دو عناصر تھے یعنی تقشف اور نشاۃ ثانیہ کے اثرات۔ اس نظم کا موضوع اور وجدان دونوں ملٹن کے تقشف کی پیداوار ہیں اس نے پیراڈائز لاسٹ کے ذریعہ سے اپنے دینی معتقدات کا اظہار کیا اور انہیں کو بنیاد قرار دیکر بندوں کے ساتھ خدا کے سلوک اور ابدی الوہیت کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اگر ایک مفکر اور معلم اخلاق کی حیثیت سے ملٹن کا تعلق متقشفین سے تھا تو ایک حسن کار کی حیثیت سے وہ نشاۃ ثانیہ کا زبردست ترجمان بھی تھا مضمون کی ترتیب اسلوب اور طرز ادا ان تمام چیزوں میں زمانہ قدیم کی ممتاز ترین رزمیہ نظموں کی شان پائی جاتی ہے جن کو ملٹن نے اپنے لئے نمونہ قرار دیا تھا۔ اس نظم میں جو وسیع اور بسیط معلومات پیش کی گئی ہیں اُن پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ تنہائی اور بے بصری کے زمانے میں ملٹن نے اپنی اوائل عمر کے مسرت بخش مطالعہ سے کس حد تک استفادہ کیا تھا۔ راستی اور راست کاری اور اخلاقی تعلیم کی اہمیت پر جابجا زور دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ علوم کی محبت اور آرٹ اور جمالیات کی پرستاری کے جذبات بھی اس نظم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دینیاتی موضوع اختیار کر کے ملٹن نے ایک ایسی اہتمم بالشان رزمیہ نظم پیش کی ہے جس کی نظیر دنیا کے جدید ادب میں نہیں مل سکتی۔

پیراڈائز لاسٹ

پیراڈائز لاسٹ میں خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت، جنت کی جنگ، باغی فرشتوں کی پسپائی، انسان اور کائنات کی تخلیق آدم و حوا کی آزمائش اور اُن کے جنت سے نکالے جانے کا بیان ہے جنت کے پُر فضا مناظر اور دوزخ کی وحشت ناکیوں کے بہترین مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ ہیرو یعنی آدم کا کردار اس قدر شاندار نہیں جتنا کہ شیطان کا۔ ملٹن کا اصل مقصد اس حقیقت کا اظہار تھا کہ کس طرح "انسان کی پہلی نافرمانی نے گناہ اور موت کو اپنے جلوس میں لیا"۔ لیکن اپنی عادت کے مطابق اس نے اپنی نظم کو بدی کی فتح پر ختم نہیں کیا۔ بلکہ ایک عالم غیب کی طرح نجات کی بشارت پر ختم کیا ہے۔

لیمو تمن کہتا ہے کہ پیراڈائز لاسٹ ایک ایسے متقشف کا خواب ہے، جو انجیل پڑھتے پڑھتے سو گیا ہو حقیقت یہ ہے کہ

اس نظم کی دلچسپی کا انحصار زیادہ تر تخیل سے اخذ کردہ مواد پر نہیں بلکہ اُن تحیر خیز معرکوں پر ہے جو ملٹن کو خواب میں نظر آئے۔

خالص ادبی کردار کی حیثیت سے ملٹن کے خدا میں بھی دو تعصّف کی تنگ خیالی اور کٹرپن پایا جاتا ہے وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے اجزائے ترکیبی میں بلا کی انانیت پائی جاتی ہے اور بجائے خادم کائنات کے وہ ایک حاکم جابر معلوم ہوتا ہے جس کے تخت کے چاروں طرف خوشامدی فرشتے ہمیشہ تملق اور چاپلوسی میں مصروف رہتے ہیں۔ ولیم لانگ کہتا ہے کہ ایسے کردار کی تلاش آسمانوں میں کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نوع دُنیا میں بہت عام ہے۔

برخلاف اس کے شیطان کا کردار لکھتے وقت ملٹن کا تخیل کسی قید و بند کا پابند نہیں رہا اور اس نے ایک ایسا کردار پیش کیا جو جرات، آزادی اور خود داری کی وجہ سے لائق تحسین ہے۔

"کیا یہی وہ مقام یہی وہ سرزمین اور وہ علاقہ ہے"
معزول معلم الملکوت نے کہا۔ "یہی جگہ ہمیں جنت کی بجائے ملی ہے؟۔
یہ غم انگیز تاریکی، اس آسمانی نور کی جگہ......
خیر پرواہ نہیں۔ چونکہ جو ہستی اصل میں ہمارے مساوی حیثیت رکھتی ہے وہ قوت اور جبر کی مدد سے ہم پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اس سے جس قدر بھی دوری رہے بہتر ہے۔
اے مسرت دوام بخشنے والے مرغزار والوداع، اے دوزخ کی ہولناکیو خوش آمدید۔ اے جہنم اپنے جدید مالک کا استقبال کر وہ جس کے عزم کو زمان و مکان کا کوئی انقلاب متزلزل نہیں کر سکتا۔
دل بجائے خود ایک دنیا ہے۔ وہ
اپنے لئے جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت میں منتقل کر سکتا ہے۔

....

....

....

یہاں ہم مزے سے حکومت کر سکیں گے اور میری رائے میں حکومت ایک آرزو کئے جانے کے قابل چیز ہے، چاہے

وہ دوزخ ہی میں کیوں نہ ہو۔ دوزخ کی حکومت جنت کی غلامی سے کہیں بہتر ہے۔

ملٹن کی یہ نظم ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی Diuina Comedia کے مساوی درجہ رکھتی ہے۔

بظاہر نظم کا اصل خاکہ مکمل ہو چکا تھا لیکن ملٹن کے دوست ٹامس الوڈ Ellwood نے ایک روز پوچھا "لیکن تو فردوس بازیافتہ سے متعلق کیا بیان کر سکتا ہے"؟ اسی سوال کے جواب میں ملٹن نے پیراڈائز لاسٹ کا دوسرا حصہ لکھا جو پیراڈائز ری گینڈ Paradise Regained کے نام سے مشہور ہے اور جس میں مسیح کی آزمائش کا ذکر ہے۔ پیراڈائز ریگینڈ کے بعض حصوں کا اسلوب یقیناً دلچسپ اور بلند آہنگ ہے لیکن دور جدید کے اکثر تنقید نگار اس امر پر متفق ہیں کہ اس نظم کی خوبیاں اس کے پیشرو عالیشان مثنوی کی تابناکیوں کی وجہ سے ماند ہو گئی ہیں۔ اس دور کی آخری یادگار ایک ڈرامائی نظم سیمسن ایگونسٹیز ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کی طرح اس نظم میں بھی ملٹن نے انجیل کے ایک موضوع کو قدیم آرٹ کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی ترتیب اور تشکیل میں یونانی حزنیہ کا پورا پورا تتبع پایا جاتا ہے جس زمانہ میں ملٹن کو رزمیہ نظم لکھنے کے لئے موضوع کی تلاش تھی۔ اس کے ذہن میں سیمسن کا قصہ آیا لیکن اس نے تنزل انسانی کی داستان کو اس پر ترجیح دی پھر اس موضوع کی طرف غالباً اس وجہ سے توجہ کی کہ سیمسن بھی ملٹن کی طرح دشمنوں سے گھرا ہوا اور مغموم نابینا تھا۔

ملٹن کی شاعری کی خصوصیتیں

شکسپیئر کے بعد ملٹن کو انگریزی شاعروں میں سب سے زیادہ عظمت و امتیاز حاصل ہے یعنی ڈرامہ کے استثنے کے ساتھ وہ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے اس کے علاوہ تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ ملٹن کا شمار دنیا کے تین یا چار باعظمت ترین شاعروں میں ہے شکسپیئر جذباتی شاعر تھا اور ملٹن نصب العینی۔ فرا انجیلیکو کی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ نصب العینی ادب کی تخلیق کی سعی سے پہلے ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنے آپ کو انسانی نصب العینیت کے اعلیٰ وارفع مقام تک پہنچا دے۔ ملٹن حیات انسانی کی جملہ لطافتوں سے آگاہ اور لطف اندوز ہونے کا متمنی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے

دن موسیقی حسن کاری اور ادبیات کے مطالعہ میں اور زیادہ تر عمیق تحقیقات اور مراقبہ میں بسر کیں۔ اعلیٰ ماحول میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اسلوب میں رفعت اور بلند پردازی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ ملٹن کی ہستی اعلیٰ ترین ذہنی دماغی اور تخلیقی کمالات کی جامع تھی وہ ایک ماہر فن مصور تھا جس کو تصویر کی جزئیات اور مجموعی کیفیت کا نقش کھینچنے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس کی تحریروں کی ممتاز خصوصیت بلند آہنگی رفعتِ ادا اور پرشکوہ الفاظ ہیں جس کو ملٹانک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی تحریروں میں رفعتِ خیال اور شوکتِ الفاظ کو قائم رکھنے میں ملٹن کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اس کی واقعہ نگاری کی استعداد بھی حیرت انگیز تھی جس کا ثبوت مختلف مثالوں سے ملتا ہے مثلاً پیراڈائز لاسٹ کا وہ ابتدائی حصہ جس میں جہنم کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ ملٹن ڈرامائی قابلیت سے بڑی حد تک محروم تھا لیکن معزول فرشتوں کی رد و قدح اور حوّا کے امتحان کی پوری داستان سے جبلت اور کردار نگاری سے متعلق اس کی باریک بینی اور عمق نظر کا پتہ چلتا ہے۔ پیراڈائز لاسٹ شروع سے آخر تک انسانی اسپرٹ سے مملو ہے۔ ملٹن کی تحریروں میں ایک گہری انفرادیت پائی جاتی ہے جو حد درجہ اثر انگیز ہے۔ رفعت خیال اور اخلاقی خلوص کی وجہ سے ملٹن کے مطالعہ کے وقت ہم اپنے آپ کو ایک ایسی ہستی کے حضور میں پاتے ہیں جس کی روح ایک ستارے کے مانند دنیوی علائق سے بلند و بالا تھی"۔

۸۰۱۱

رابندرا ناتھ ٹیگور کی
ادبی زندگی کا آغاز

از

مخدوم محی الدین صاحب بی ۔ اے ۔ عثمانیہ معتمد بزم اردو

رابندرا ناتھ ٹیگور جس گھر میں پیدا ہوے وہ مذہب اور فنونِ لطیفہ کا گہوارہ تھا اور جس فضا میں آنکھ کھولی وہ یکسر شعر و موسیقیت کی فضا تھی جبلی صلاحیتوں کو اس ماحول میں پرورش پانے کا خوب موقع ملا ۔ چنانچہ ٹیگور نے آٹھ سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا ۔

ایک نیلی بیاض ہمیشہ ساتھ رہتی تھی جو شعر یا نظم موزوں ہوتی اُسے فوراً نقل کر لیا کرتے تھے شدہ شدہ ساتھیوں استادوں اور گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ رابی (بچپن میں انھیں پیار سے رابی کہا جاتا تھا) شعر کہتا ہے ۔ سب سے پہلی نظم جو انھوں نے لکھی وہ "کنول" پر ہے ۔ ان کے بڑے بھائی خوشی اور فخر کے ساتھ سب سے ٹیگور کا بحیثیت شاعر تعارف کراتے ٹیگور خوش الحانی کے ساتھ اُسے پڑھتے' سننے والے سب تعریف کرتے اور نوخیز شاعر کی ہمت بڑھاتے ۔

گوبندا بابو نے جو ٹیگور کے استاد تھے اور جو انھیں بہت چاہتے تھے ایک دن پوچھا "تو تم شعر بھی کہتے ہو ؟" شاعر نے بغیر پس و پیش کے "ہاں" کہا ۔ اس پر مہربان استاد نے ایک اخلاقی نظم لکھنے کی فرمائش کی ۔ جب اُنھوں نے نظم لکھی تو بابو نے اعلیٰ جماعت کے لڑکوں کے سامنے شاعر کو بلا کر نظم سنانے کے لئے کہا ۔ جب ٹیگور نے نظم سنائی تو کسی نے یقین نہیں کیا کہ اتنی اچھی نظم اس بچہ نے لکھی ہے ۔ بعض لڑکوں نے جل کر یہ بھی کہا " یہ نظم جہاں سے نقل کی گئی ہے ہم بتا سکتے ہیں

گر جب ثبوت طلب کیا گیا تو سب بغلیں جھانکنے لگے۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ ماگھ کے تہوار کے موقع پر جو مناجاتیں گائی گئیں انھیں سے اکثر ٹیگور ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک مناجات کا مصرع یہ ہے۔ "آنکھ تجھکو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ جو ہر ایک کے آنکھ کی پتلی ہے" اس پر ٹیگور کے والد نے کہا اگر ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور ادب کو جانتا تو ضرور انعام دیتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے میں یہ خدمت انجام دونگا۔ یہ کہکر ایک چک ننھے شاعر کے حوالہ کیا۔

۱۸۷۵ - ۸۱

(عمر ۱۴ سال)

اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ٹیگور کی شاعرانہ اور ادبیانہ کوششیں مکان کے محدود حلقہ سے گزر کر منظر عام پر آجائیں "گیان انکر" ایک ماہوار رسالہ ان کی تمام نظموں کو شائع کرنے لگا۔ ایک تنقیدی اور کسی قدر تاریخی مضمون نے بھی نہیں جگہ پائی۔ اس وقت عمر ۱۵ سال تھی۔

ان کے بڑے بھائی جیوتندرا ناتھ نے ایک ماہوار رسالہ "بھارتی" نکالنا شروع کیا تھا۔ ٹیگور بھی مجلس ادارت کے شریک بنائے گئے۔ یہ رسالہ اُن کی نظموں کے اظہار کا واسطہ بن گیا۔ اس دور کو ہم بھارتی کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔

ان کی ایک طویل نظم "کوی کہانی" (سرگذشت شاعر) بھارتی ہی میں نمودار ہوئی۔ یہ اس عمر کا نتیجہ فکر ہے جبکہ لکھنے والا گرم و سرد زمانہ کا کچھ بھی تجربہ نہ رکھتا تھا۔ ان کا یہ پہلا ادبی کارنامہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔

بھنو سنگھ

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ان کے زیر مطالعہ وشنو اشاعروں کا کلام زیادہ رہا ہے۔ اس لئے ابتدائی کلام بالکل چندی داس اور ودیا پتی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے بھنو سنگھ کے فرضی نام سے چند نظمیں لکھیں۔ یہ زبان اسلوب اور خیالات کے لحاظ سے اتنے پاکیزہ اور ایسا قدامت کا رنگ لئے ہوئے تھیں کہ بالکل وشنو اشاعروں کا کلام معلوم ہوتا تھا۔

جو سنتا بے ساختہ داد دیتا۔ جب زیادہ شہرت ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ان نظموں کا لکھنے والا بھنو سنگھ نہیں یہ خود ہیں مگر کسی نے یقین نہیں کیا۔ غرض ایک عرصہ تک یہ اپنے ہم وطنوں کو بیوقوف بنائے رکھے۔ یہ غلط فہمی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ٹیگور اس ضمن میں نشی تی کنتا چترجی کا واقعہ بڑی دلچسپی سے بیان کرتے ہیں۔

صاحب موصوف کو جرمنی نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری اس کارنامہ کے صلہ میں دی کہ انھوں نے بنگالی اور اور یورپی شاعری کا Cyric کا تقابلی مطالعہ کر کے مقالہ پیش کیا تھا جس میں بھنو سنگھ کو بنگال کے ایک قدیم شاعر کی حیثیت سے بڑی عزت دی گئی تھی۔ حالانکہ بھنو سنگھ ٹیگور ہی کا ایک فرضی نام تھا۔

لندن کا سفر (۱۸۷۷)

ان کے بھائی احمد آباد کے جج تھے۔ ان کی بیوی بچے لندن میں مقیم تھے۔ رابندر ناتھ چند مہینے احمد آباد میں ٹھیر کر ۲۰ ستمبر کو اپنے بھائی کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔

وہاں کی دنیا ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ اپنی گھریلو زندگی سے وہ ایک دم ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں کے بسنے والے زبان، رنگ اور آداب وطرز معاشرت میں اُن سے بالکل مختلف تھے۔ اس سفر کا مقصد بیارسٹری کا امتحان پاس کرنا تھا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قیام لندن کے زمانہ میں اور مدرسوں کے علاوہ یونورسٹی کالج میں انگریزی ادب کی تعلیم پاکر انگریزی ادب سے متاثر ہوتے رہے۔ ایک سال کے بعد پھر ہندوستان واپس آئے یہ سفر ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی وقفہ نہیں پیدا کیا۔ بلکہ مشغولیتیں آنے تک برابر جاری رہیں۔ نظم سے زیادہ نثری کارنامہ اس دور کا زیادہ قابل لحاظ ہے۔ دوران اور قیام سفر میں انھوں نے ایک سلسلہ خطوط کا لکھنا شروع کیا جو مسلسل بھارتی میں شائع ہوتے رہے۔ خط نویسی میں ان کو اچھا ملکہ ہے۔ ان کے خطوط ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں "دل شکستہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کی ابتدا ابتداء سفر ہی سے ہو چکی تھی مگر ہندوستان میں آکر اُس کی تکمیل ہوئی۔ بھارتی میں نمودار ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم اور اپنے اس دور پر شاعر خود تیس سال بعد ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے۔ "جب میں نے دل شکستہ" لکھنا شروع کیا میں اٹھارہ برس کا تھا جبکہ میں نہ پورا جوان تھا اور نہ پورا بچہ

یہ عمر صداقت کی راست شعاعوں سے منور نہیں ہوتی بلکہ اس کی جھلکیاں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور باقی سب سایہ ہے۔ غروب آفتاب کے وقت کے سایہ کی طرح اس کے تصورات دراز اور موہوم ہیں جو حقیقی دنیا کو وہم میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس زمانہ کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ نہ صرف میں بلکہ آس پاس کے ہر شخص کو مجھ جیسا اٹھارہ سالہ سمجھتا تھا۔ اور ہم سب بے بنیاد اور غیر موجود تخیلی دنیا کی طرف جا رہے تھے جہاں کہ بہت ہی شدید مسرت اور غم بھی ایک خواب کی دنیا کی مسرت اور غم معلوم ہوتا تھا۔ میری عمر کا ۱۵ یا ۱۶ سے ۲۲ یا ۲۳ سال کا زمانہ بالکل غیر منتظم زمانہ ہے۔"

صبح کے گیت اور شام کے گیت

جب اپنے نفس اور خارجی دنیا میں عدم مطابقت ہوتی ہے تو انسان دل میں ایک درد محسوس کرتا ہے الفاظ سے زیادہ آہ اور چیخ ہی اس سوز نہانی کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ شاعر ٹیگور اب شباب کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ سن کے لحاظ سے کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھا۔ "شام کے گیت" اور "صبح کے گیت" اس دور کے مختلف نظموں کے مجموعے ہیں جو شاعر کے قلبی کیفیات کی تلاطم خیزیوں کا اچھا مرقع ہیں۔

شام کے گیت کے عنوانات ہی اس کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر کے دل میں کتنا درد اور حزن بھرا ہوا ہے۔ "ناامیدی امید" "ایک ستارے کی خودکشی" "دعوت حزن" "بے دل کی عورت" "دل کا مرثیہ" اب ان کے کلام میں انفرادیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے انقلابی اور جدید رومانی شاعر کی حیثیت سے ان کا وقار قائم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سیل جو بڑے نقاد ہیں ان نظموں کے متعلق لکھتے ہیں "یہ نظمیں موضوع اور جذبات کی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستانی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔"

ساتھ ہی ساتھ یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان کی شاعری کی تعمیر کا بالکل ابتدائی زمانہ ہونے کی وجہ سے باوجود اپنے محاسن کے یہ نظمیں سقم سے بالکل خالی نہیں ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی کلام میں تنوع کا فقدان اور تکرار خیال Monotony of Thought کی زیادتی نمایاں بتلائی جاتی ہے۔

دو موسیقیانہ طربیے (میوزیکل کامیڈیز) (۱) جوہر والمیکی (دی جینس آف والمیکی) (۲) خطرناک

ٹھکار (دی فیٹ فل ہنٹ) اس قومی کیفیت کو توڑتے ہیں

جوہر والمیکی۔ اس ڈرامہ کا پلاٹ والمیکی کے قصہ سے لیا گیا ہے۔ والمیکی پہلے ایک ڈاکو تھا۔ سارس کے جوڑے کے دردناک واقعہ سے متاثر ہوکر موزوں الفاظ میں اس نے نوحہ لکھا۔ سارس کا واقعہ یہ تھا کہ کسی شکاری نے سارس کے ساتھی کو مار دیا تھا اور وہ اکیلی تھی۔ والمیکی نے رامائنہ بھی اسی بحر میں لکھی ہے ان کے یورپ جانے سے پہلے گھر میں عموماً ایسی مجلسیں ہوتی تھیں جہاں باذاق لوگ جمع ہوا کرتے تھے اور مہمانوں کی غذا اور دوسری مفرحات سے ضیافت کی جاتی تھی۔ جب یہ یورپ سے واپس آئے تو ایک ایسی ہی آخری مجلس منعقد ہوئی اس موقع کے لئے یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ والمیکی کا پارٹ خود ڈاکٹر ٹیگور نے ادا کیا۔ اور ان کی بھتیجی نے سرسوتی کا کام کیا تھا۔

گو اس ڈرامہ میں بعض نظمیں واقعی شاعرانہ خوبیاں رکھتی ہیں مگر پورے کا پورا ڈرامہ محض وقتیہ اثر پیدا کرنے والا ہے جس میں محض موسیقی کی خاطر الفاظ جڑ دیئے گئے ہیں۔ اس کو تو اسٹیج پر دیکھنے اور سننے ہی میں مزا آتا ہے۔ یوں پڑھیں تو کچھ زیادہ لطف نہ آئیگا۔ اس ڈرامہ میں کچھ نظمیں اکشیا بابو کی بھی ہیں۔ اور کچھ دہاری لال چکرورتی کے سار دامنگل سے ماخوذ ہیں۔

پہلے ڈرامہ کی کامیابی نے انھیں دوسرا ڈرامہ لکھنے کی ہمت بندھائی "خطرناک شکار" اس ڈرامہ میں دسرتھ کے ہاتھوں سادھو کے بیٹے کے قتل کا قصہ ہے۔ جب اسٹیج کیا گیا تو پبلک بہت متاثر ہوئی۔

موسیقی رابندرا ناتھ کی رگ و پے میں سرائت کئے ہوئے ہے۔ نئے نئے راگ بنانے اور ان کو لفظی جامہ پہنانے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ جس کا مظاہرہ اُن کے کلام سے ہوتا ہے۔ پھر یہ ڈرامے اس وقت لکھے گئے جب کہ گھر میں موسیقی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے موسیقی کے کوئی اور مشغلہ نہیں تھا یہی اسباب تھے جس کی وجہ سے دو موسیقانہ ڈرامے پیدا ہوئے جس میں موسیقی کے کمالات کا خوب اظہار ہوا ہے۔

ان ڈراموں میں آئرستانی شاعر ٹامس مور کا اثر بتلایا جاتا ہے۔ غالباً ان ڈراموں کے لکھنے کے محرک بھی آئرش میلوڈیز ہی ہیں۔ کیونکہ انگلستان جانے سے پہلے اکشیا بابو کی صحبت میں آئرش میلوڈیز کی مصور جلد

پڑھنے کا انھیں اتفاق ہوا تھا جس نے شاعر کے دماغ پر قدیم آئرستانی تہذیب کا ایک موہوم سا نقش جما دیا۔ آئرستانی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش شدت کے ساتھ ان کے دل میں جگہ پا گئی تھی جب یہ ولایت گئے تو یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ اور کئی راگ بھی سیکھے۔ ان طربیوں میں انہیں راگوں کو داخل کیا گیا ہے۔ ہندستانی اور آئرستانی راگوں کے اِمتزاج سے ایک نئی کیفیت پیدا کی جس کی ان سے پہلے کسی نے ہمت نہیں کی۔

اس کے بعد ہی صبح کے گیت آتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی بلند تفکر اور تخیل کی حامی ہیں۔ اس مجموعہ میں نظموں کے بعض عنوانات یہ ہیں۔ "کائنات کا خواب" "زندگی کی سرمدیت" "فطرت سے اتحاد" "اپنے خواب سے جاگا ہوا فوارہ" "نغمہ۔ محبت۔ زندگی" اس آخری نظم کی نسبت ڈاکٹر سیل کہتے ہیں کہ اپنی رفعت کے اعتبار سے گوئٹے کی تھری رونس سے کچھ ہی کم ہے۔ یہ نظمیں بندش کی چستی اور اسلوب کی روانی میں اپنی پیش رو نظموں کے مقابلہ میں امتیازی برتری رکھتی ہیں اور شاعر کے آئندہ رجحانات کا پتہ لگانے میں مدد دیتی ہیں یہ دوران کی ادبی زندگی کا دیباچہ تھا جو ان نظموں پر ختم ہوا۔

(از)

نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی۔ اے (عثمانیہ)

اِس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اِس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خاندانِ پائے گاہ کے کئی بزرگ "شمس الامراء" کے خطاب سے ممتاز رہے ہیں۔ ابوالفتح خان بہادر تیغ جنگ شمس الامراءِ اول کے صاحبزادے، محمد فخرالدین خاں بہادر شمس الامراءِ ثانی سب سے پہلے امیر پائے گاہ ہیں، جن کی علم دوستی و علم پروری آج تک مشہور رہے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت گیارہ سال کے بچے ہی تھے، لیکن اپنی مادرِ مہربان کے زیر تربیت جس طرح خاندانی سپاہ گری کے فنون میں کمال حاصل کیا تھا، اسی طرح ذوق علم و فضل میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

اِن کے زمانۂ حیات کے ایک مشہور مصنف، خواجہ غلام حسین خاں، المخاطب بہ خان زماں نے اپنی تاریخ "گلزار آصفیہ" میں اِن کی علمی فضیلت کے متعلق اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"آن سرخیلِ امرائے نامدار، امیریست صاحبِ شان و شوکت و شکوہ، انبوہِ جاہ و حشمت قدردانِ کمال، وجویائے اہلِ کمال، رفیق پرور، ستودہ خصال، نجیب شناس، صاحبِ تصانیفِ علوم حکمت، علی الخصوص در علم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ و ہیئت باشد، و نیز در علم جرثقیل رسالہ ہائے عمدہ تصنیف فرمودہ "ستہ شمسیہ" کہ مشہور آفاق

دریں سلسلہ علم ریاضی را آن قدر سہل و آسان تر نمود کہ طفلے نو رساندک توجہ و شوق بحصولِ مقاصد و مطالب بلند و مآرب دل پسند ارجمند می رسد، اگر بو علی سینا زندہ می بود، دادِ این تحریرِ دل فزا می داد، و نیز در علم حساب رسالۂ خلاصہ بہ تحریرِ تصنیف آورد کہ آن علم لطیف خلاصہ تر شدہ بہ فہم و ادراکِ ہر ذی فہم می آید۔ اگر شیخ بہاؤ الدین عاملی می دید بصد دل و جان بہ ثنائے بے پایان لبِ انصاف می کشاد۔

مہذا، مدرسہ ہائے متعدد در بلدۂ حیدر آباد، باستادانِ کامل علوم مقرر فرمودہ کہ طفلانِ غربا بے شمار شبانہ روز بتحصیلِ علوم نقلی و عقلی مشغول و مصروف اند۔ این سعادتِ کبریٰ و موہبتِ عظمیٰ در ہیچ عہدِ سلف، پادشاہان قطبیہ تا این زمان حضورہیں قدر دان بود کہ بہ ظہور آمد۔ و تا قیام روزگار مشہور خواہد بود، و برائے خوشنودیِ طفلاں، و توجہ شوق ایشان دو دو روپیہ ماہوار میوہ خوری بہ ہر ہر طفل می دہند۔ چنان چہ ہر ہر طفل سراپا شوق گشتہ از علوم فقہی خبردار عقائد و مسائلِ عبادات گردیدہ است، و مجموعِ بہ استادِ خویش مشغولِ نمازِ پنج گانہ صیامِ ماہِ رمضان المبارک ہستند"[1]

یہی وہ شمس الامرا ہیں جنہوں نے حکمت، ہندسہ، ریاضی، وغیرہ کی کتابیں سب سے پہلی دفعہ اردو میں لکھوائیں، اور خود تصنیف کیں۔ ان کے فرزندوں میں ایک محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک تھے اور دوسرے محمد رشید الدین خاں اقتدار الملک اول الذکر شمس الامرا ثالث اور موخر الذکر شمس الامرا رابع "سمجھے جاتے ہیں تیسرے فرزند محمد بدر الدین خاں بہادر تیغ معظم الملک تھے، جو عنفوانِ شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کی نسبت، ان کی کم عمری ہی میں مصنفِ گلزارِ آصفیہ نے لکھا تھا کہ " اگر فضائلِ علمی از حکمت و ریاضی وغیرہ بہ ارقام آرد، دفتر بے پایاں باید"[2]

ہمارے اس مضمون کا تعلق ان ہی متذکرہ چار اراکینِ خاندانِ پائے گاہ سے ہے۔ اول الذکر یعنے نواب فخر الدین خاں شمس الامرائے ثانی خود بہت بڑے مصنف اور زبانِ اردو کے محسن تھے۔ ان کی مصنفہ کتابیں اس وقت تک موجود ہیں۔ انہوں نے خود کام کرنے کے علاوہ اپنے ملازمین اور مصاحبین سے بھی کئی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں

---

[1] گلزارِ آصفیہ (۲۸۸)

[2] گلزارِ آصفیہ (۲۹۱)

جن میں سے فی الحال حسب ذیل اس وقت تک دستیاب ہوئی ہیں

(۱) ستہ شمسیہ' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس کی (۶) جلدیں ہیں' ان کا دیباچہ (جو خود نواب محمد فخرالدین خاں بہادر کا لکھا ہوا ہے) ظاہر کرتا ہے کہ' ان کو جدید ترین علوم و فنون سے کیسی دلچسپی تھی چنانچہ انہوں نے ان رسالوں کے مجموعہ کو (یورپ کی زبانوں کی کئی کتابیں منگواکر' اور اپنے زیر نگرانی' اپنے ہی ملازمین سے) اردو میں مرتب کرایا جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں :۔

"بندہ' نیازمند درگاہِ ایزدی کا' محمد فخرالدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء' اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی' علومِ فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں بہ سبب میلانِ طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا' میری سماعت میں آئیں' اس جہت سے چند مسائل اُن کے از بر تھے' اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں' چنانچہ علم جر ثقیل' اور علم انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے' بلکہ بعضے علوم اہلِ فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ اُن کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا چنانچہ علم آب' اور ہوا' اور برق' اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبانِ فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا' اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے اُن کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی' پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے"۔

اور اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :۔

"حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے رُوبرو ترجمہ کریں چنانچہ بفضلِ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے۔ مگر بعضے اسمائے انگریزی اصطلاح کے جو زبانِ عربی اور فارسی میں نہ میسر ہو سکے اُن کو اسی زبانِ اصلی پر بحال رکھنے میں آیا' اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھ علم پر مشتمل ہیں اس واسطے نام ان کا "ستہ شمسیہ" رکھا گیا۔ مگر مناسب جان کے علمِ مقناطیس کو علم انظار کی جلد سے علیحدہ کر کے آخر میں جلد برق کے

شریک کیا گیا، اور مادۂ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا حافظ مولوی شمس الدین فیض کا یہ ہے -

"تالیف نواب شمس الامراء"
(۱۲۵۳)

(۲) ان چھ کتابوں کے علاوہ فی الحال گیارہ اردو کی کتابیں ہیں اور ملی ہیں جو نواب صاحب معز کے حسب الحکم یا اُن کی سرپرستی میں، یا اُن کی اس علمی دلچسپی کے باعث لکھی گئی ہیں، اور ان ہی کے چھاپے خانے میں حسب تفصیل ذیل چھپکر شائع بھی ہوئیں - چنانچہ

(۱) سنہ ۱۲۵۱ھ میں ایک رسالہ "موتی کے چونکالنے" کے متعلق طبع ہوا

(۲) و (۳) سنہ ۱۲۵۲ھ میں رسالۂ "مختصر جرثقیل" اور رسالۂ "اصولِ علم حساب" کی طباعت عمل میں آئی -

(۴) سنہ ۱۲۵۳ھ میں "رسالۂ کسوراتِ اعشاریہ" چھپا -

(۵) سنہ ۱۲۵۵ھ میں رسالۂ "اسطرلاب کروی" مطبوع ہوا -

(۶) سنہ ۱۲۵۹ھ میں "علمِ کیمسٹری" کا رسالہ حلیہ طبع پایا -

(۷) سنہ ۱۲۶۰ھ میں رسالۂ مفتاح الافلاک جو اصل میں بادشاہِ اودھ، نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھا اور چھاپا گیا تھا، اور جس کی چند جلدیں نواب صاحب موصوف نے خرید فرما کر اس فن کے متعلمین کو تقسیم کی تھیں. اسی رسالہ کو اور اس کے شکال کو ان خواہشمندوں کی سربراہی کے لئے علٰحدہ علٰحدہ جلدوں میں خود اپنے سنگی چھاپے خانے میں چھپوا کر تقسیم فرمایا -

(۸) و (۹) سنہ ۱۲۶۱ھ میں "فضل الآداب آصفیہ" اور "رسالہ کیمسٹری" نے طباعت کا جامہ پہنا -

(۱۰) سنہ ۱۲۶۴ھ میں "رسالۂ مختصر حیوانات مطلق" چھاپا گیا -

(۱۱) سنہ ۱۲۶۶ھ میں ترجمۂ مرقع تصویراتِ حیوانات" نے مطبوعہ صورت اختیار کی -

(۳) نواب فخر الدین خاں بہادر کو، علوم و فنون کے علاوہ، شعر و شاعری سے بھی بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ دکن کے شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے شعراء بھی آپ کی قدردانیوں سے مالامال ہوتے رہے. آفاق اور شہرت تو آپ کے یہاں ملازم ہی تھے - اور ہر تقریب یا عیدین میں قصیدے وغیرہ پیش کرکے انعامات سے سرفراز ہوتے

تھے۔ ان کا کلام اور شاعرانہ نکتہ سنجیاں اور خوش بیانیاں، قلمی مخطوطات کی صورت میں ہمارے کتب خانہ میں اب تک محفوظ ہیں۔

حیدرآباد کے شعراء میں مولوی حافظ میر شمس الدین محمد فیض کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی چنانچہ ان کی کئی تاریخیں خود شمس الامراء بہادر کی اکثر کتابوں میں، اور دوسرے ارکین خاندان کی تالیفات پر بھی موجود ہیں ان کا ایک اردو، خالق باری کے طرز کا رسالہ "فیض جاری" بھی اسی مطبع سے ۱۲۵۰ھ میں چھپا، جو نواب صاحب ہی کے حکم سے لکھا گیا تھا۔

(۴) آخر میں نواب فخرالدین خاں بہادر کی خود ذاتی تصانیف کا ذکر ضروری ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کی اردو کتابوں کی نسبت یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے کہ دیباچہ میں بجائے اپنا نام لکھنے کے صرف یہ لکھدیا ہے کہ "مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے"۔ البتہ فارسی کتابوں میں اس کی اکثر صاف وضاحت کی ہے مثلاً کتاب "شمس الھندسہ" جو ۱۲۵۱ھ میں چھپی، اس کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

"می گوید مؤلف این رسالہ محمد فخرالدین خان المخاطب بہ شمس الامراء غفر اللہ ولوالدیہ" کہ کتاب اقلیدس" اگرچہ حاوی جمیع اصولِ ہندسیہ است، از وقتِ براہین و تطویلِ دلائلش مبتدی را بہرۂ وافی و طالب را نتیجہ کافی دست نمی داد۔ لہذا اکثر در خاطر تلاشِ کتابے بود کہ اولہ اشکالش قریب الفہم باشند درین ولا، نسخۂ خوب از تالیفات موسیٰ کلارک کہ در زبان فرانسیس مشتمل بہ دہ مقالہ بود بہم رسید و دیدم کہ در آن کتاب اعمالِ اصولِ اشکال سطحہ مجسمہ بہ دلائل واضحہ قریب الفہم کہ از ان کارہائے اعمال بہ آسانی می بر آیند، مرقوم اند، لہذا نظر فائدۂ طالبان، آن کتاب را از زبانِ فرانسیس بہ زبانِ فارسی مرقوم نمودہ شد، تا در روزگار موجب یادگار باشد"۔

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو فرانسیسی زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔

دوسری کتاب "فن جال" پر ہے جو ۱۲۵۱ھ میں لکھی گئی، جس کے دیباچہ کی چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں "مؤلف این رسالہ محمد فخرالدین خان المخاطب بہ شمس الامراء غفر اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ، برارباب این فن و مہندسین و مصورین مبرہن می گرداند کہ از مدتے مکنونِ خاطر بود کہ "در فنِ جال" آنچہ اعمال و اشکال متخرجہ اہلِ کمال ہنا

حال بملاحظہ رسیدند، وہرچہ از مزاولت مشق، این مولف صورتِ استخراج یافتند، ہمہ را بقید قلم آرد تا طالبانِ این فن را فائدہ، تازہ و مسرتِ بے اندازہ حاصل آید۔ الحال بہ کرم ایزدِ متعال در ۱۲۴۴ یک ہزار و دو صد و چہل و چہار ہجری نبوی از دست داد فرصتے رسالہ بہ طریقِ اختصار مترتب ساخت۔"

نواب محمد رفیع الدین خاں بہادر اپنے والد کی زندگی ہی میں اپنے علم وفضل اور تصنیف و تالیف کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں جو کتابیں مطبع شمس الامراء میں چھپیں وہ زیادہ تر انہیں کی فرمائش اور دلچسپی کی وجہ سے لکھی گئی تھیں چنانچہ بعض کتابوں میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ صاحبزادہ نواب محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک بہادر کی فرمائش پر لکھی گئی۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد یہ جہاں ان کے خطابات اور جاگیرات کے زیادہ حصہ کے وارث ہوئے ان کا علم و فضل اور شوق تصنیف و تالیف بھی زیادہ تر انہی کے حصے میں آیا۔ فرق یہی تھا کہ شمس الامراء ثانی نے زیادہ تر فارسی میں لکھا اور رفیع الدین خاں شمس الامراء ثالث نے اردو میں۔

نواب رفیع الدین خاں کی جو کتابیں اس وقت تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں اکثر ایسی ہیں جو ان کے والد کی زندگی میں لکھی اور چھاپی جا چکی ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر کرتی ہے کہ نواب فخرالدین خاں کے زمانۂ حیات میں دوسرے مصنفین اور مولفین کی جو اردو کتابیں نواب شمس الامراء کے سنگی چھاپے خانے میں چھپیں اور جن میں سے بعض کے نام ان کے تذکرہ میں درج کر دیئے گئے ہیں ان کی تصنیف اور اشاعت و طباعت میں اپنے والد کی دلچسپی کے ساتھ نواب رفیع الدین خاں بہادر کی توجہ اور شوق برابر کے شریک رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفیع الدین خاں بہادر کی لیاقت و علمی شغف سے ان کے والد بھی واقف تھے اور اس کی قدر کرتے تھے چنانچہ اپنی مشہور کتاب "شمس الہندسہ" میں انھوں نے اپنے فرزند کی نکالی ہوئی شکلوں کو بھی داخل کر لیا اور اس کا ذکر اپنے دیباچہ میں اس طرح سے کیا "چند اشکال مستخرجہ برخوردار محمد رفیع الدین خاں بہادر عمدۃ الدولہ اطال اللہ عمرہ در آخر مقالہائے متعلقہ آنہا بہ تفصیل مرقوم ساختہ۔"

اردو زبان میں تصنیف و تالیف کرنے اور دوسروں سے لکھوانے کی وجہ سے عہدِ حاضر میں نواب رفیع الدین خاں بہادر

کی شخصیت کو بہت اہمیت دی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اپنے والد کے بعد پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مغربی اور جدید ترین علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوششیں کیں ان کی نسبت یہ مختصر سا مضمون ناکافی ہے۔ ان کی اردو تصنیفات اس قابل ہیں کہ ان پر علحدہ کتابیں لکھی جائیں۔ ہماری کتاب میں ان کا تفصیلی ذکر موجود رہے گا۔ یہاں ہم صرف چند کتابوں کے نام درج کر دیتے ہیں۔

(١) رسالہ علم ہندسہ	مطبوعہ	سنہ ١٢٥٠ھ
(٢) رفیع الحساب	"	سنہ ١٢٥٢ھ
(٣) تکملہ رفیع الحساب	"	سنہ ١٢٥٤ھ
(٤) رفیع البصر	"	سنہ ١٢٥٧ھ
(٥) رفیع الصنعت	"	سنہ ١٢٦٩ھ
(٦) رفیع الترکیب	"	سنہ ١٢٨٤ھ

ان مطبوعہ اردو کتابوں کے علاوہ نواب رفیع الدین خاں بہادر شمس الامرائے ثالث کی تصنیفات میں کئی قلمی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں "رسالہ شطرنج" خاصکر قابلِ ذکر ہے۔

نواب رفیع الدین خاں بہادر کی لکھائی ہوئی یعنی حسب الحکم اور حسب فرمائش کتابوں کے تذکرہ کے لئے بھی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ ہماری کتاب میں ان کی تفصیل مندرج رہے گی۔

دوسرے فرزند محمد رشید الدین خاں بہادر کو بھی علمی شوق تھا، چنانچہ انہوں نے ایک تاریخ "رشید الدین خانی" ١٢٧٠ھ لکھوائی، جو اس وقت دکن کی تاریخوں میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔

اسکے مولف، غلام امام خاں المتخلص بہ ہجراں ابن محمد منہور خاں ہیں، جنہوں نے اسکو سنہ ١٢٧٠ھ میں نواب صاحب معز کے حکم سے تالیف کیا۔ کتاب کا نام بھی خود تاریخی ہے اور ان کے ایک شاگرد گلزار علیخاں ہوشؔ نے "تاریخ ہند" سے بھی مادہ تاریخ نکالا ہے۔

کتاب مولف کی زندگی ہی میں مطبع خورشیدیہ میں طبع ہوئی۔ اور ١٧ ذیقعدہ سنہ ١٢٨٢ھ کو اسکی طباعت اختتام کو پہنچی، اسکے (٥٦٠) صفحے ہیں۔ اس کتاب کی وقعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گارساں دی تاسی جیسے شخص نے اپنے خطبات میں اسکی بڑی مدح سرائی کی ہے۔

اس کتاب کے مولف نے اور دوسری کتابیں "مدحیہ شمسیہ" اور "تاریخ خورشید جاہی" وغیرہ بھی لکھی ہیں۔

تیسرے فرزند محمد بدرالدین خاں بہادر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے بہت جلد انتقال کر گئے، انہیں آرٹ اور خوشنویسی وغیرہ سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک مرقع موجود ہے جس میں انہوں نے ناخن سے نہایت اعلیٰ درجہ کی تصویریں اور قطعے وغیرہ تیار کئے ہیں اس عجیب و غریب مرقع کی تاریخ اس زمانہ کے مشہور شاعر فیض نے اس طرح لکھی ہے جو اس مرقع کے آخر میں مندرج ہے ؎

از ناخن خود معظم الملک آراست چو این چنین مرقع
اے فیض سنش بگفت مانی ناخن بدلم زد این مرقع
۱۲۱۵ھ

اس مختصر سے زمانۂ حیات میں انھوں نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ انہیں شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا جس کی یادگار میں اپنا ایک دیوان چھوڑا ہے جس کی نسبت ہم نے اپنی کتاب میں تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ ان کی تمام تصنیفات میں شجرۂ آصفیہ جس کا تاریخی نام "وقایع معظمہ" ہے بہت مشہور ہے جس کو انہوں نے ۱۲۵۰ھ میں مرتب کیا۔ چنانچہ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:۔

"اما بعد ضعف العباد محمد بدرالدین خاں بہادر المخاطب معظم الدولہ خلف امیر کبیر شمس الامرا بہادر دام ظلہ و اقبالہ بہ تحریر این سطور کہ در ذکر حسب و نسب مغفرت مآب آصف جاہ اول و اولادش و عشایر و اقارب نواب مذکور بہ سعی بسیار و تلاش بے شمار و آن چہ کہ بہ دریافت رسید، بہ پاس خاطر مولوی میر حافظ شمس الدین فیض و میر عبداللطیف حکیم پرداختم۔ در عہد امنیت مہد آصف جاہ رابع نواب ناصرالدولہ بہادر خلد اللہ ملکہ و زاد عمرہٗ و اجلالہٗ کہ بہ دو واسطہ نبیرۂ نواب مغفرت مآب اند۔ در ماہ ربیع الاول ۱۲۵۰ھ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و دو ہجری بہ یک اصل و سہ فرع ترتیب دادہ موسوم بہ "شجرۂ آصفیہ" و دیگر نام این رسالہ کہ مادۂ تاریخ این است " وقائع معظمہ " واللہ الموفق بالاتمام و المعین بخیر الاختتام۔

نواب بدرالدین خاں کے بعد بھی خاندانِ شمس الامرا کے متعدد افراد نے علمی سرپرستی کی اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی لی مثلاً نواب محتشم الدولہ بہادر، سر آسمان جاہ بہادر، سر خورشید جاہ بہادر، سر وقار الامرا بہادر وغیرہ مگر ان سب کے ذکر کے لئے کسی اور مضمون کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہماری کتاب میں تفصیل درج رہے گی۔

---

(۱)

مخدوم محی الدین بی۔ اے معتمد بزم اردو

بجلیاں ٹوٹ پڑیں کشت پہ حاصل میں ہوں   صید بے مہری عالم ہوں جلا دل میں ہوں
عقلیں حیران ہیں وہ عقدۂ مشکل میں ہوں   لہریں خوشیوں کی نہ دیکھی ہوں وہ ساحل میں ہوں

رقصِ شعلہ ہوں میں بے تابیِ بسمل میں ہوں

مسندِ جور کے نوشاہ او سرمایہ دار   دھجیاں دامنِ دولت کی اڑانے دے مجھے

(۲)

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارہ ہوں میں   خود پرستار خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں   خرمنِ جور جلادے وہ شرارہ ہوں میں

بحرِ تخریب کا ناپید کنارہ ہوں میں

میری فریاد پر اہلِ دول انگشت بہ گوش؟   لا تبر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

(۳)

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا   شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑونگا

ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑ ونگا عشرت آبادِ امارت کا مکاں توڑ ونگا
گرزِ حق سے سرِ باطل کا گماں توڑوں گا
توڑ ڈالونگا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

(۴)

رسم کہنہ کو تہ خاک ملانے دے مجھے برق بن کر بت ماضی کو گرانے دے مجھے
تفرقے مذہب وملت کے مٹانے دے مجھے خواب فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
کیا ہوں میں ؟ ٹھیر! ذرا ہوش میں آنے دے مجھے
کیا ہوں اک آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

طور

انشا

مخدوم محی الدین بی۔ اے معتمد بزم اُردو

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اَب بھی

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا ہیں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے نازو انداز حیا ہیں نے

یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا ہیں نے
سنی پہلے پہل تھی دل دھڑکنے کی صدا ہیں نے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اَب بھی

دلوں میں ازدحام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے

جبینوں پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اَب بھی

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جام شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگین رباب آتا

مجھے رنگینوں میں رنگنے رنگینِ سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شراب آتا

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اَب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگین بدن کی لغزشیں ہوتیں

رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں   خفائے راز کی پُر لطف باہم کوششیں ہوتیں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں   تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں

جو چھو لیتا میں اُس کو وہ نہا جاتا پسینے میں   مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر و اوہام سے کوسوں دور ہوتی تھی   سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی   ملک جھولا جھولاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی   مگر اُس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

وجدانیات

از

سکندر علی صاحب وجد متعلم بی۔اے عثمانیہ

وصل میں وہ مزا کہاں تھا جو فراق یار میں
حیف کٹی نہ زندگی کیوں تیرے انتظار میں

فصل خزاں قریب ہے، حالتِ گل عجیب ہے
درد کی ٹیس آ چلی زمزمۂ ہزار میں

پوچھ نہ حالِ آشیاں کس میں ہے طاقتِ بیاں
صد ہی تو سن لے ہمزباں آگ لگی بہار میں

لاکھ ہوں ظلم یا ستم در سے ہٹینگے کیوں قدم
بس میں پڑے ہیں دل کے ہم۔ دل ہے تری اختیار میں

ظلم ہیں ان پہ بیشتر جن پہ کرم کی ہے نظر
رنگِ وفا ہے کس قدر جور و ستم شعار میں

وائے وریدہ دامنی! گل جو چنے تھے گر گئے
خار ہی خار رہ گئے دامن تار تار میں

وجد خیال آخرت دل میں نہ آ سکا کبھی
عمر اخیر ہو چلی عشق کے کاروبار میں

وجدانیات

از

سکندر علی صاحب وجد متعلم بی۔اے۔ عثمانیہ)

آتا ہے شبِ غم میں بہت نام تیرا یاد   سچ ہے کہ اُٹھے درد تو آتی ہے دوا یاد

صحرا میں جو کانٹوں نے نکالیں ہیں زبانیں   شاید اُنھیں آیا ہے کوئی آبلہ پا یاد

دن عیش کے کٹتے ہیں پرستش میں بتوں کی   اُفتاد جو پڑتی ہے تو آتا ہے خدا یاد

شکوہ کیا پیماں شکنی کا تو وہ بولے   کمبخت یہ وعدہ نہیں رہتا بخدا یاد

اے وجد ترے خون نے وہ رنگ جمایا

بھولے سے بھی آیا نہ انھیں رنگِ حنا یاد

از

محمد عبدالحی خاں صاحب شارق۔ متعلم سال چہارم

بادل کا گھر کے آنا ترغیب میکشی کی
کھلنا چمن میں گل کا تصویر ہے ہنسی کی
سبزہ کا لہلہانا تعبیر بیکلی کی
شاخوں کی نرم جنبش انگڑائیاں کسی کی
صحن چمن نہیں ہے محفل ہے عاشقی کی

ہم سیر کر رہے تھے ڈالے گلے میں باہیں
دل پاک تھے ہمارے معصوم تھیں نگاہیں
ہوتے تھے عہد و پیماں باہم سدا نباہیں
چاہیں اگر کسی کو تو بس تمہیں کو چاہیں
دل بھولتا نہیں ہے روداد کمسنی کی

نظریں بچا رہے ہیں آنکھیں چرا رہے ہیں

ابرو پہ بل پڑے ہیں گو مسکرا رہی ہیں
کیوں آپ ہی وہ مجھ سے شرما ئی جا رہی ہیں
نیچی ہیں کیوں نگاہیں کیوں لب چبا رہی ہیں

واللہ مجھ سے پوچھو پہچان بے رخی کی

تاروں میں کیوں دمک ہی کیوں برق میں چمک ہے
کیوں ہے زمین ساکن گردش میں کیوں فلک ہے
کیوں نالہ زن ہے بلبل کیوں پھول میں مہک ہے
ہے خار میں کھٹک کیوں کیوں قلب میں کسک ہے

اے کاش کوئی کر دے تفسیر زندگی کی

وہ چاندنی کا منظر، وہ موج زن سمندر
پیش نظر بلوریں جام شراب احمر
بکھرائے زلف مشکیں اپنے جبین و رخ پر
گہ بے حجاب نظریں گہ شرمسار تیور

مت پوچھ ہمنشین تو بدمستیاں کسی کی

یہ پُر شباب آنکھیں آنکھوں میں رنگ مستی
قربان ہو رہی ہے سو جان سے مے پرستی
بجلی کا یہ چمکنا یہ رات مینہ برستی
توبہ ہے یا ہے کوئی بے بادبان کشتی

مرضی پہ چھوڑتا ہوں دریائے میکشی کی

از

میر سعادت علی رضوی بی۔ اے۔ صدر بزمِ اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

جس کی تقدیر مخالف ہو وہ تدبیر ہوں میں ۔۔۔ جو نہ مٹتی نہ بدلتی ہے وہ تحریر ہوں میں

شرح کرنا میری ہستی کا بہت مشکل ہے ۔۔۔ سینکڑوں جس میں ہیں اجمال وہ تفسیر ہوں میں

رنگ بھرنا میرے نقاش کو منظور نہیں ۔۔۔ خون ہوتے ہوئے ارمانوں کی تصویر ہوں میں

مانع طوفِ حرم ہے میرا احساس خودی ۔۔۔ دستِ قدرت کی بنائی ہوئی تعمیر ہوں میں

مجھ میں کیا دفترِ حکمت ہیں کوئی کیا جانے ۔۔۔ بے زبان بولنے والے تیری تقریر ہوں میں

آئینہ دیکھنے والے نے بہلا کیا دیکھا ۔۔۔ چلتی پھرتی کسی نقاش کی تصویر ہوں میں

اشرف خلق بنایا ہے کسی نے مجھکو ۔۔۔ ماسوا اللہ میں گونجی ہوئی تکبیر ہوں میں

زندگی ہستی موہوم کا ایک خوابِ گران ۔۔۔ موت کہتی ہے اسی خواب کی تعبیر ہوں میں

صبر کر حشر کا دن دور نہیں اے صادق
وہ نہ بخشے تو کہوں کونسی تقصیر ہوں میں

از

میر سعادت علی رضوی۔ بی۔ اے۔ صدر بزم اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱)

یہ نور کی پتلی نوری ہے
اور اپنے دھن کی پوری ہے
ہے شعلہ فشانی کام اس کا
اور شمعِ فروزاں نام اس کا
محفل کی یہ زیب و زینت ہے
کیا چاند سی اس کی صورت ہے
وہ جذبِ محبت میں کامل
میں ذوقِ شہادت میں کامل
وہ میری پرستش کرتی ہے
میں اس کی عبادت کرتا ہوں

وہ مجھکو جلا کر جلتی ہے
میں جان کے اس پر مرتا ہوں

—— (۲) ——

بے عیب ہے اس کا سیم بدن
محفل رخ انور سے روشن
خاموش ہے ظاہر ہیں گویا
آتش کا ہے لیکن پرکالہ
فانوس کے پردے میں ہے نہاں
اور نور حجابوں سے بھی عیاں
سودا میرا مجنوں کیا جانے
یہ ذوق تپش لیلیٰ میں کہاں
وہ درد محبت سہتی ہے
میں اس سے الفت کرتا ہوں
وہ مجھکو جلا کر جلتی ہے
میں جان کے اس پر مرتا ہوں

—— (۳) ——

مطلوب ہے وہ میں طالب ہوں
وہ روح ہے اور میں قالب ہوں
میں گوش سماعت ہوں ہمہ تن
خاموشی ہے اس کا طرز سخن

گلگیر سے ہو سر اس کا قلم
قدموں پہ نکلے میرا دم
یاں شور پر پرواز نہیں
جلنے میں وہاں آواز نہیں
گھل گھل کے وہ پانی ہوتی ہے
میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں
وہ مجھکو جلا کر جلتی ہے
میں جان کے اس پر مرتا ہوں

از

ابوالخیر سید ابراہیم حسینی صاحب۔ بی۔ اے

بزمِ اردو کو قایم کیے ہوئے آج تین سال ہوتے ہیں اس عرصے میں بزم کے اراکین نے جو علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں اُن کو اجمالاً یہاں بیان کیا جاتا ہے جس سے واضح ہوگا کہ اس قلیل عرصے میں اراکین بزم کس قدر سرگرمی سے میدان ادب میں گام زن رہے اور ہیں۔

تنقید و تحقیق

یوں تو ہمارے کلیہ کے اکثر طالب علم تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھتے رہتے ہیں لیکن ہماری بزم کے اراکین [illegible]ص طور پر اس شعبہ میں ممتاز ہیں۔ کئی کتابیں اس تین سال کے قلیل عرصے میں لکھی گئیں جنمیں سے چند شائع ہو چکی ہیں اور زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور عنقریب منظر عام پر جلوہ گر ہو جائینگی۔

[illegible]ڈسورتھ:۔ یہ کتاب [illegible] صاحب نے لکھی ہے جس کی خوبی کے متعلق بے شمار رائیں وصول ہوئیں اور اردو کے معیاری

رسائل میں تنقیدیں چھپ چکی ہیں اردو داں حضرات ورڈسورتھ کی شاعری سے بہت کم واقف تھے اس کتاب کی وجہ سے اچھی طرح روشناس ہوگئے یہ کتاب ہر لحاظ سے اچھی ہونے کے علاوہ اردو داں طبقے پر ایک احسانِ عظیم ہے (طبع ہو چکی ہے)

سوانح عمری :- یہ کتاب بھی میر حسن صاحب کی لکھی ہوئی ہے جس میں اس فن کے اصول وضوابط کے ساتھ اردو سوانح عمریوں کے ارتقا پر بھی بحث کی گئی ہے۔ آخری حصے میں اردو سوانح عمریوں پر ایک تفصیلی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

تاریخ ادب انگریزی :- یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ اب تک تاریخ ادب انگریزی پر کوئی کتاب اردو میں نہیں تھی اس کام کی ابتدا سابق معتمد بزم زاہد علی صاحب کامل کے ہاتھوں ہوئی تھی انھوں نے اس کام کو شکسپیر کے عہد تک انجام دیا۔ لیکن ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کام بھی میر حسن صاحب کے سپرد کیا گیا جو بفضلہ اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ کتاب زیر طبع ہے۔

درد اور اس کی شاعری :- غلام محمد خاں صاحب صدر انجمن اتحاد کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں درد اور اُن کے متعلقین کی سوانح حیات اُن کی تصنیفات اُن کے شاگردوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور دوسرے حصے میں درد کی شاعری اور ان کے اصناف سخن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خانصاحب کی یہ ایک کامیاب تحقیق ہے۔

یوسف ہندی قید فرنگ میں :- اس میں محسن بن شبیر صاحب نے غالب کے قید ہونے کے واقعات کو تحقیقی معلومات حاصل کرنے کے بعد نہایت محنت و جانفشانی سے لکھا ہے۔ ان کی یہ ابتدائی کوشش بہت کامیاب رہی (طبع ہو چکی ہے)

دکن میں مرثیہ گوئی :- سعادت علی صاحب رضوی (صدر بزم اردو) کی یہ کتاب زیر ترتیب ہے۔ توقع ہے کہ بہت جلد چھپ جائیگی جس سے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔ رضوی صاحب نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تمہیدی۔ ابتدائی۔ متوسط۔ عروجی۔ تمہیدی حصہ میں مرثیہ کی تعریف ہے عربی فارسی مرثیوں پر تنقیدی اور اردو مرثیوں پر ایک عام نظر ڈالی گئی ہے

ابتدائی حصے میں سلطنت بیجاپور اور گولکنڈہ کے آغاز و عروج اور اس زمانے کی مرثیہ نگاری کے متعلق لکھا گیا ہے۔

متوسط دور میں دکنی سلطنتوں کے زوال اور اُس وقت کے مرثیہ گویوں کا حال درج ہے۔

آخری حصے میں سلطنتِ آصفیہ کے عروج اور اردو مرثیہ کی ارتقائی کوششوں کا حال ہے۔ انیس کے دکن آنے کے بعد سے آج تک جدید دکنی مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ کر کے رضوی صاحب نے قوتِ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دیا ہے اُن کی یہ محنت علمی راہ میں قابل مبارکباد ہے۔

ٹیگور:۔ مخدوم محی الدین صاحب (معتمد بزم اردو) کی یہ کتاب ٹیگور کی شاعری اور اس کی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اعظم کی ابتدائی زندگی۔ اس کے کلام پر تنقید اور تعمیری کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض اس کی زندگی اور کلام میں مطابقت کرتے ہوئے اُن تمام واقعات کا اظہار کیا گیا ہے جس سے سر رابندر ناتھ کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر پڑھنے والے کے پیش نظر ہو جاتی ہے اور یہی سوانح نگار کی بڑی کامیابی ہے۔

قصائد نصرتی:۔ سید علی صاحب نے اس تنقیدی کتاب میں اپنی محنت اور کاوش کا پتہ دیا ہے اور حسب ذیل معلومات فراہم کی ہیں (۱) صنفِ قصیدہ کی تحقیق و تاریخ (۲) نصرتی اور موجودہ دکھنی زبان کی لسانی خصوصیتیں (۳) نصرتی کی خوبیاں اور خامیاں (۴) فارسی اور اردو کے دیگر قصیدہ گو شعراء سے مقابلہ۔ (۵) نصرتی کی حیات۔ آخر میں متروک اور حل طلب الفاظ کی فہرست بھی دی ہے۔ سید علی صاحب کی یہ خدمت قدیم اُردو ادب کی زندگی کا باعث ہے۔

شمس الامرا:۔ شمس الامرا اور انکے ادبی شغف سے کون واقف نہیں۔ نواب صاحب کو علم ہندسہ سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ اس فن میں خود انہیں کی تصانیف اُن کے کتب خانہ میں موجود ہیں لیکن ان میں سے نہ کوئی کتاب منظر عام پر آئی اور نہ اُن پر اب تک کوئی مضمون لکھا گیا۔ اُن کے پوتے اور ہمارے بزم کے ممبر نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور شمس الامرا کے ادبی کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں جو بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔

ترجمے

سید الانبیاء:۔ کارلائل کے دو سرے لکچر HEROES AND HERO WORSHIP کا ترجمہ ہے جو اعظم خاں صاحب نے بڑی محنت سے سلیس زبان میں کیا ہے۔ کتاب طبع ہو کر نہایت مقبول ہو چکی ہے۔

رہنمائے صحت:۔ گاندھی جی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اعظم خاں صاحب کی یہ محنت بھی قابلِ داد ہے۔

گولڈ اسمتھ کے خطوط:۔ سرفراز علی صاحب کی یہ ابتدائی کوشش ہے جو کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ ترجمے میں اگرچہ کچھ خامیاں رہ گئی ہیں لیکن مترجم کی محنت اور سعی قابل ستایش ہے۔

وکار آف ویکفیلڈ۔ میر حسن صاحب نے گولڈ اسمتھ کی اس مشہور ناول کا ترجمہ شروع کیا ہے نصف سے زیادہ کتاب اردو میں منتقل ہو چکی ہے۔ مترجم کی یہ کوشش کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ کا اسلوب بھی مصنف کتاب کے اسلوب سے ملتا جلتا رہے ابھی سے کامیاب نظر آتی ہے۔

ناول

نقاب کی سرگرمیاں، جرم اور خون:۔ یہ دونوں ناول عزیز احمد صاحب کی تصنیف سے جدید ناول نگاری کے اچھے نمایندے ہیں اور مصنف کی تخلیقی قوت کے زبردست گواہ ہیں (زیر طبع)

سوز الفت:۔ ڈوما کے ناول "لیڈی آف دی کمی لیا" کا ایک آزاد ترجمہ ہے جس کو اعظم خاں صاحب نے حیدرآباد کے ماحول اور کرداروں کے ساتھ اپنی زبان میں پیش کیا ہے۔

افسانے

میر حسن صاحب۔ عزیز احمد صاحب۔ غلام محمد خاں صاحب۔ اعظم خاں صاحب۔ اختر حسن صاحب۔ بادشاہ علی صاحب اور فخر الدین صاحب ہماری بزم کے وہ سرگرم اراکین ہیں جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے افسانے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں کی امتیازی خصوصیت علاوہ زبان کے اُن کا منفرد طرز ہے۔

ڈرامے

ہماری بزم کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کے وجود میں آتے ہی کالج میں ڈرامہ اسٹیج کیا جانے لگا یعنے جس سال ہماری بزم قائم ہوئی اسی سال عزیز احمد صاحب کا لکھا ہوا ایک سوشل ڈرامہ "کالج کے دن" جشن یوم کلیہ کے موقع پر

اسٹیج کیا گیا اور بہت کامیاب رہا۔ مکمل ڈرامہ مجلۂ عثمانیہ میں شائع ہو چکا ہے جس کا معیار مصنف کی قابلیت کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد صاحب نے "مستقبل" "خطرناک ملاقات" اور "عمر خیام" (جو پورا نظم میں ہے) یہ تین ڈرامے لکھے۔ اسی سال میر حسن صاحب اور مخدوم محی الدین صاحب کی باہمی کوشش کا نتیجہ ایک سوشل ڈرامہ "ہوش کے ناخن" کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ ڈرامہ پہلے یوم کلیہ کے موقع پر اور بعد انجمن طیلسانیین کی امداد میں اسٹیج کیا گیا اور دونوں مرتبہ نہایت کامیاب رہا۔

میر حسن صاحب نے "پروین" نامی ایک اور ڈرامہ لکھا ہے جو سٹی کالج کے طلبائے قدیم کے سالنامے میں چھپ رہا ہے۔

غلام محمد خاں صاحب نے بھی "حسنِ سلوک" ایک سوشل ڈرامہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا۔

ڈرامے لکھنے کے علاوہ اداکاری میں بھی ہماری بزم کے ارکین خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ اس خصوص میں مخدوم محی الدین صاحب کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ جو اداکاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اب تک خراجِ تحسین کے ساتھ ساتھ کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

شاعری

گو یہ چیز فطری ہے جس کے لئے ضروری نہیں کہ شاعر ادب کا طالب علم ہی ہو لیکن ہماری بزم کے ارکین اس صنف میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور آئے دن نظمیں اور غزلیں کہتے رہتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے۔ علی حسنین صاحب زیبا کا نام آتا ہے جو کافی غزلیں لکھنے کے بعد اب نظموں کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ بلند خیالی۔ مضمون آفرینی اور سادگی اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

مخدوم محی الدین صاحب جنہوں نے حال ہی میں شعر کہنا شروع کیا ہے زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں۔

اختر حسن صاحب اختر۔ عبدالحی خاں صاحب شارق۔ محمد صدیق صاحب برق۔ شعیب احمد صاحب حزیں

سکندر علی صاحب وجد ۔ فخر الدین صاحب جمیل بھی غزل گو ہیں جن کی اکثر غزلیں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں

ارکین کی ادبی مصروفیتوں پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بزم اردو کے طلبا تنقید اور تحقیق کی طرف زیادہ مائل ہیں جس کی وجہ سے اُن کے ادبی ذوق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے امید ہے کہ مستقبل قریب میں بزم اردو کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے ارکین اور اُن کی تصنیفات ادبی دنیا میں پائندہ شہرت حاصل کریں گی اور اردو کا ادبی ذخیرہ ان کی وجہ سے مالا مال ہوتا جائیگا ۔

جنابِ صدر و معزز حاضرین!

بزمی یا انتخابی رواج کے مطابق مجھے سب سے پہلے ارکین بزم اردو کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جن کی رائے شماری نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنی بزم کا صدر منتخب کریں میں اس کو ان کی قدردانی اور اپنی حوصلا افزائی سمجھکر خلوصِ دل سے قبول کرتا ہوں اس سال یہ بارِ گراں میرے سر ہے میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ حسن و خوبی اپنے تمام فرائض انجام دے سکوں گا اور بزم چند قدم آگے بڑھ سکیگی لیکن جہاں تک امکانی کوشش کا تعلق ہے میں اس کو اپنا اولین فرض سمجھکر ہر طرح بزم کی ترقی کا ساعی رہونگا۔ اس بزم کی نوعیت سے تو آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ یہ آج اپنے تیسرے سال میں قدم رکھ رہی ہے اس دو سال کے عرصہ میں اس نے جو نمایاں خدمتیں انجام دی ہیں اُن کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بین الکلیاتی ادبی مصروفیتوں میں بزم نے ہر اعتبار سے بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا ایک اہم مقصد (جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں) اردو زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی ہے۔ بزم اردو جو طلبہ کی ایک مختصر سی مجموعی کوشش ہے طلبہ کی حد تک اپنا وہی مطمح نظر رکھتی ہے جو ہماری جامعہ کا ہے۔

اگر رسالوں کی کثرت۔ اخبارات کی بہتات اور نئی نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھکر اندازہ لگائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کو بہت کچھ فروغ ہوچکا ہے۔ لیکن غور کیجئے تو حقیقت میں ایسا نہیں ابھی ہمارے ملک میں اردو ادب کی وہ قدر جس کا وہ مستحق ہے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اکثر ادیب اپنے سینوں کی دولت اور دماغوں کی قوت سے بیخبر ہیں اور اردو خوان دنیا اس اصول سے ناواقف ہے کہ ادب سے کیسے کیسے کام نکل سکتے ہیں۔ ایک ادیب پر اپنے جوہر اصلی کی حفاظت کرنا فرض

ہے اور اس کو اس حفاظت میں مدد دینا اہل ملک کے لئے لازم ہے۔ اسی خیال کے مدنظر بزم اردو کی طرف سے ایک مجلہ کی اشاعت کی تجویز مدت سے زیر غور تھی۔ بزم کی جملہ اہم تجاویز میں سے یہی ایک تجویز تھی جو اب تک عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ اس سال میرا سب سے پہلا فرض یہ ہوگا کہ اس رسالہ کے اجرا کی کوشش کروں یہ ایک خالص معیاری ادبی مجلہ ہوگا۔ جو سال میں ایک مرتبہ سالنامہ کی شکل میں نکالا کریگا جس میں نہ صرف اراکین بزم کی سال بھر کی علمی و ادبی کاوشیں اور تحقیقات درج رہینگی بلکہ دوسرے انشاپردازوں کے ایسے بلند پایہ مضامین بھی شائع ہونگے۔ جنسے اراکین کے ادبی ذوق میں اضافہ اور عام اردو ادب میں ترقی ہوگی۔ دقت یہ ہے کہ کسی چیز کا اجرا و آغاز آسان ہے لیکن اس کا قیام مشکل ہوجاتا ہے۔ اس قیام کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ عوام میں اس کام سے دلچسپی پیدا کی جائے اور عوام کی دلچسپی کے لئے بعض اوقات معیار کی قربانی ضروری ہوجاتی ہے ان دونوں چیزوں کا ساتھ ساتھ لے چلنا ہی مشکل کام ہے۔ امید ہے کہ ملک کے ارباب قلم اس ادبی کام میں ہمارا ہاتھ بٹا کر ممنون فرمائینگے۔

حضرات! میرا ایک اور قصد یہ ہے کہ اس سال سے بزم اردو کی بڑی بڑی اور اہم مصروفیتیں بطور سالگرہ کے ایک ہی زمانہ میں منعقد ہوا کریں جن میں بزم کا سالانہ تقریری مقابلہ، تحریری مقابلہ، مشاعرہ اور جلسۂ تقسیم انعامات ہوا کریں اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان مصروفیتوں کے باعث بزم میں زندگی اور سرگرمی کے آثار مستقل ہوجائینگے اور ایسے اہم جلسوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں جو اہتمام کرنے پڑتے ہیں ان کی گوناگون زحمتوں سے عہدہ داران بزم کچھ سہولت حاصل کرینگے بین الکلیاتی تعاون کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنے علمی جلسوں میں نظام کالج اور دوسرے کلیہ جات کے ادبی انجمنوں کے اراکین اور انفرادی طور پر ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کو مدعو کریں تو بزم روز بروز کامیاب تر ہوتی جائیگی اور اسکی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔

ایک اور بات جو میرے خیال میں نہایت ضروری ہے وہ اُن مقامات کا سفر ہے جو کوئی ادبی اہمیت رکھتے ہوں یا جہاں کوئی علمی ادبی ادارہ اپنی خاص سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اس سلسلے میں زندہ مصنفین سے ملاقات اور ان سے علمی و ادبی موضوعوں پر تبادلہ خیالات بھی ایک اہم اور دلچسپ مصروفیت رہے گی۔

آخر میں میں حاضرین جلسہ اور خصوصاً ہمارے ہر دلعزیز صدر صاحب کلیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُن سے اور بزم کے تمام نظما یعنے مولوی عبدالحق صاحب۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ اور جناب عبدالقادر صاحب سروری سے متمنی ہوں کہ جسطرح اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود بزم کی مصروفیتوں میں دلچسپی لے رہے ہیں آئندہ بھی اسیطرح لینگے۔ فقط

رپورٹ سالانہ

مرتبہ

مخدوم محی الدین صاحب معتمد بزم اردو

ہماری کابینہ نے جو حسبِ ذیل حضرات پر مشتمل ہے ۲۷ مہر ۱۳۴۲ف کو جائزہ حاصل کیا ۔

صدر ۔ میر سعادت علی صاحب رضوی ۔ بی ۔ اے ۔

معتمد ۔ مخدوم محی الدین متعلم سالِ چہارم

خازن ۔ محمد عابد حسین صاحب " " "

اراکین :۔

سال ششم ۔ علی حسنین صاحب زیبا سال سوم ۔ فضلِ الٰہی خان صاحب

سال پنجم ۔ غلام محمد خاں صاحب سال دوم ۔ محمد عمر صاحب

سال چہارم ۔ سید علی صاحب سال اول ۔ خواجہ حمید الدین صاحب

بزم ہذا کی کابینہ کا ایک کاروباری جلسہ میر سعادت علی صاحب رضوی کی صدارت میں ۳ آذر ۱۳۴۲ف کو لسانیات منزل (عمارات قدیم) میں قرار پایا تاکہ سال رواں کے موازنہ کے لئے ترتیب دے اور بزم کی دلچسپیوں کا نظام العمل

تیار کرے۔ جناب عابد حسین صاحب نے موازنہ پیش کیا اور بحث و تکرار کے بعد حسب ذیل موازنہ و نظام العمل منظور ہوا:-

کل متوقع آمدنی از ممبران بزم بحساب فی ممبر (عصہ) سالانہ	للعہ
اخراجات متوقع۔ انعامات	عسہ
مشاعرہ	عسہ
متفرقات	للعہ
مدِ محفوظ	لعہ

غیر معمولی جلسے کم از کم دو اور معمولی جلسے کم از کم چار ہوں گے۔

جناب سعادت صاحب رضوی کی یہ تحریکات باتفاق آرا منظور ہوئیں کہ بہ شرطِ گنجائش "یوم بزم اردو" منایا جائے۔ جس میں بین کلیاتی تحریری و تقریری مقابلے۔ مشاعرہ اور تقسیم انعامات بھی ہونگے۔

بہ شرطِ گنجائش بزم کی طرف سے ایک علمی مجلہ پیش کیا جائے جس میں اراکین بزم کے علاوہ دیگر اربابِ قلم کے مقالے بھی شریک ہوں اسی میں بزم کی سالانہ رپورٹ بھی شامل رہے۔

بزم کی مالی حالت مستحکم کرنے کے لئے بزم کے دوامی اراکین پیدا کئے جائیں جن کے حقوق یہ ہونگے۔

۱۔ سالنامہ مفت دیا جائے گا۔

۲۔ یوم بزم میں دعوت دی جائے گی۔

۳۔ حق رائے دہی حاصل ہوگا لیکن مجلسِ انتظامی کے رکن نہ ہوسکیں گے۔

۴۔ بزم کے مطبوعات ایک تہائی رعایتی قیمت سے دیئے جائیں گے۔

کابینۂ ہذا نے اپنے مجوزہ لائحہ عمل پر کاربند ہونے کی پوری کوشش کی سوائے اس کے کہ وہ عمارتی اور مالی مجبوریوں کی وجہ سے 'یوم بزم' نہ منا سکی۔ اب یہ آنے والوں کا کام ہے کہ وہ مالی مشکلات پر غلبہ پاکر اس مبارک روایت کو قائم کریں۔

غیر معمولی جلسے

بزم نے ۱۱؍آبان ۱۳۴۲ف کو (عماراتِ قدیم کلیہ میں) ایک غیر معمولی جلسہ مولوی عبدالحق صاحب ناظم بزم کی صدارت میں منعقد کیا جس میں جناب عزیز احمد صاحب نے اپنا مقالہ "جدید روسی تھیٹر" پڑھا جو نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات تھا۔

۱۰؍اردی ۱۳۴۳ف کو بزم کا ایک معمولی جلسہ جناب سعادت علی صاحب رضوی صدر بزم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اس موضوع پر بحث کی گئی۔

"ادبیات کا ترجمہ غیر مفید اور ناممکن ہے"

موافق۔ مولوی محسن صاحب صدر انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ اور مخالف مولوی محمد یحییٰ صدیقی صاحب تھے۔ ان کی تقریروں کے بعد دوسرے مقررین نے موافقت اور مخالفت میں تقریریں کیں۔ بہ غلبۂ آرا رخ مخالفت کامیاب رہی۔ رائے شماری کے بعد مولوی عبدالحق صاحب صدر ناظم بزم نے موضوع کی مخالفت میں کچھ دیر ارشاد فرمایا۔

دوسرا غیر معمولی جلسہ ۱۲؍دی ۱۳۴۳ف کو منعقد ہوا جس کا موضوع بحث "اہل زبان نے اردو کو نقصان پہنچایا" تھا۔ موافق۔ مولوی اعظم خاں صاحب متعلم۔ ایم۔اے اور مخالف مولوی ابوالخیر صاحب متعلم سال چہارم تھے۔ بہ غلبۂ آرا تحریک کامیاب ہوئی۔

بزم کے تمام جلسوں میں یہ بات بہت ہمت افزا تھی کہ اراکین بزم کے علاوہ دوسرے طلبا نے بزم کی اہمیت کو محسوس کر کے مباحثوں میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔

تعلیمی تفریح

بزم اردو کے مقاصد میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ایسے مواقع فراہم کرے جس سے اراکین بزم

کے معاشرتی تعلقات مستحکم ہوں اور ان کی ذہنی قوتوں کی عمدہ پیرائے میں تربیت ہو چنانچہ اسی مقصد کے تحت بزم ہذا نے تعلیمی تفریح کو بھی اپنے نظام العمل میں شریک کر لیا۔

۱۹ اکٹوبر ۱۹۳۳ء کو بزم ہذا کی طرف سے قلعہ گولکنڈہ میں ایک تعلیمی تفریح منائی گئی جس میں علاوہ بزم کے ارکین کے دوسری بزموں کے ارکین بھی شامل تھے اور لڑکوں کی تعداد تقریباً ۶۰ تھی۔ اس جماعت نے پہلے قطب شاہی گنبدوں کا معائنہ کیا۔ جہاں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے ان سلاطین کے ادبی شغف اور اردو کی سرپرستی کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قلعہ کے موتی محل کے بارے میں تقریر فرماتے ہوئے اس عہد کے زنانہ و مردانہ حصہ مکان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ جب یہ جماعت بالاحصار پر پہنچی تو مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے "بالاحصار" پر ایک دلچسپ اور پُراز معلومات تقریر فرمائی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا راست طریقہ تعلیم طلبا پر کتنے مفید اثرات ڈالتا ہے۔ یہ طریقۂ تفریح اس کابینہ نے شروع کیا ہم آنے والوں سے متوقع ہیں کہ وہ اس مفید روائت کو برقرار رکھیں گے۔

علمی مجلہ کا اجراء

بزم کے لائحہ عمل میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ بہ شرط گنجائش سالنامہ کو علمی مجلہ کی صورت میں پیش کرے اس تجویز کی عملی شکل آپ کے سامنے ہے جو ارکین بزم و غیر ارکین بزم سب ہی کے علمی و ادبی جد و جہد کا اچھا نمونہ ہے اگر یہ سوال پیدا ہو کہ بزم نے اپنے محدود و مختصر سے موازنہ میں اس کی گنجائش کیسے پیدا کرلی کہ ایسا مجلہ پیش کر سکے تو اس کا جواب ہمارے کابینہ کے صدر نواب میر سعادت علی خاں صاحب رضوی ہیں۔ یہ آپ ہی کی کوششوں اور امداد کا نتیجہ ہے کہ ہماری یہ تجویز عملی صورت اختیار کر سکی۔

دوامی ارکین

صاحب موصوف ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آپ کو حسب ذیل دوامی ارکین کے نام نظر آ رہے ہیں

جن کی وجہ سے بزم کی مالی مشکلات میں بڑی حد تک کمی ہوئی۔

۱۔ عالیجناب مولوی میر مصطفےٰ علیخانصاحب ناظم دوم فوجداری بلدہ
۲۔ عالیجناب نواب سید علیخانصاحب جعفری جاگیردار۔
۳۔ عالیجناب مولوی سید ابو الحسن صاحب رضوی۔ اول تعلقدار ضلع پربھنی۔
۴۔ عالیجناب مولوی میر احمد علی خاں صاحب۔ اول تعلقدار ضلع رائچور
۵۔ عالیجناب نواب سید علی خاں صاحب خلف نواب صارم جنگ مرحوم
۶۔ عالیجناب مولوی خورشید مرزا صاحب۔ ناظم معدنیات۔
۷۔ عالیجناب نواب مرزا جعفر علی خانصاحب جاگیردار۔
۸۔ عالیجناب مولوی میر تقی علی صاحب۔ محکمہ بند وبست سرکار عالی
۹۔ عالیجناب مولوی سید عبدالحسین صاحب محکمہ بلدیہ حیدرآباد۔
۱۰۔ عالیجناب مولوی قدرت احمد صاحب راز (علیگ) مدرس دار العلوم

بین کلیاتی فی البدیہہ تحریری مقابلہ

بتاریخ ۱۲ آذر ۱۳۴۳ف جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارت میں صبح کے دس بجے بزم اردو کا سالانہ فی البدیہہ تحریری مقابلہ منعقد ہوا۔ ہم مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے ملحقہ کلیات نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ چنانچہ باوجود تنگ وقت پر اطلاع دینے کے ورنگل کالج نے اپنے نمایندے بھیجے۔ کلیہ اناث کے امیدواروں کے لئے وہیں زنانہ کالج ہی میں انتظام تھا۔ لڑکیوں کی تعداد تقریباً لڑکوں کے برابر تھی۔

موضوع "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" تھا۔ ممتحنین مولوی عبد الحق صاحب صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ریڈر پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ اور مولوی سید محمد صاحب پروفیسر اردو سٹی کالج تھے۔ ہماری جامعہ کے طالب علم اختر حسن صاحب متعلم سال چہارم اس مقابلہ میں اول

اور سکندر علی صاحب وجدؔ دوم آئے۔ رولنگ کپ علیہ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب سابق صدر بزم اور کتابیں اول و دوم کو من جانب بزم انعام میں دی جائیں گی۔

کلیۂ اناث کے امیدواروں میں جو سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے اُسے بھی بزم کی طرف سے کتابیں انعام دی جائیں گی۔

بین کلیاتی فی البدیہہ تقریری مقابلہ

اُسی روز ۲ بجے اسی مقام پر سالانہ فی البدیہہ تقریری مقابلہ منعقد کیا گیا۔ تین موضوع دیئے گئے تھے۔ ہر امیدوار کو کسی ایک مضمون کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔

۱- اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

۲- ہوا بازی کی اہمیت۔ ۳- صحافت کی اہمیت

عالیجناب مولوی عبد المجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ جناب میر سعادت علی خاں صاحب صدر بزم اور مخدوم محی الدین معتمد بزم اس مقابلے کے حکم تھے۔ کلیہ ورنگل کے نمایندے عبد الحی خاں صاحب اس مقابلہ میں اول آئے اور رولنگ کپ علیہ جناب میر سعادت علیخاں صاحب صدر بزم کے مستحق قرار پائے اور سکندر علی صاحب وجدؔ متعلم جامعہ عثمانیہ دوم آئے جنھیں بزم کیجانب سے کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

ہمارے تمام مصروفیتوں میں ہمارے بزم کے نظار اور ہمارے شفیق اساتذہ عالیجناب مولوی عبد الحق صاحب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔ اور مولوی عبد القادر صاحب سروری نے بہت دلچسپی لی جن کا شکریہ ادا کرنا ہمارا انتہائی خوشگوار فرض ہے۔

بغیر ان کی رہنمائی کے ہم اپنا کام اس خوش اسلوبی سے انجام نہ دے سکتے۔

عالیجناب مولوی محمد عبد الرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ ہمارے بزم کے ساتھ خاص ہمدردی و دلچسپی رکھتے اور اکثر ہمارے لئے وقت نکالکر ہمارے جلسوں میں شرکت فرماکر طلبا نوازی فرماتے رہے ہیں عالیجناب صدر صاحب کا پرخلوص شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی رپورٹ کو ختم کرتا ہوں۔

مطبع عہد آفریں میں چھپا